ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

Monthly JUHD-E-HAQ - October-2019 - Registered No. CPL-13

(قیمت 10 روپے)

جلد نمبر 26......شمارہ نمبر 10......اکتوبر 2019

ماورائے عدالت قتل: آخر کب تک؟

میر پور خاص، 30 ستمبر 2019 : ایچ آر سی پی نے ''مزدوروں کے استحصال کے خاتمے'' کے موضوع پر ایک مشاورتی ورکشاپ کا اہتمام کیا

پشاور، 20 ستمبر 2019 : ایچ آر سی پی نے ''پاکستان کی عالمی قانونی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر مشاورتی اجلاس منعقد کیا

گلگت، 23 ستمبر 2019 : ایچ آر سی پی نے ''پاکستان کی عالمی قانونی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر مشاورتی اجلاس منعقد کیا

فہرست

پریس ریلیزیں 03

میں اپنی بیٹی کو روٹی دوں یا تعلیم 05

جیل کے نظام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے 08

کانجو محلے کے بلونگڑے 09

ہم ''انسان'' کے ساتھ کھڑے ہیں 10

چونیاں (قصور) میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور ان کے قتل کے واقعات پر فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ 11

کیا پولیس ٹھیک ہو سکتی ہے؟ نوآبادیاتی دور سے پاکستان تک ایک جائزہ 18

پاکستان میں پڑھا لکھا کون ہے؟ 20

بھائی کب تک وراثتی جائیداد سے بہنوں کا حصہ کھاتے رہیں گے؟ 21

افسانہ: بندوق موجد کی کہانی 22

سول انتظامیہ کی مدد کے لیے کے پی حکومت کا حکم نامہ تشویش کا باعث ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو یہ جان کر بہت تشویش ہوئی ہے کہ خیبر پختونخوا (کے پی) کی حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کیا ہے جس نے مسلح افواج کے بعض ایسے اختیارات کو پورے صوبے تک توسیع دے دی ہے جو پہلے 'سول انتظامیہ کی معاونت کے لیے' 2011 ریگولیشنز کے تحت سابق فاٹا اور پاٹا تک محدود تھے۔

ایچ آر سی پی کو خدشہ ہے کہ اس حکم نامے کے ذریعے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کو قانونی تحفظ مل سکتا ہے۔ سابق فاٹا اور پاٹا کو کے پی کا حصہ بنانے کا مقصد فاٹا کے رہائشیوں کو بنیادی حقوق کی فراہمی اور انصاف تک رسائی دینا تھا جس سے وہ کئی دہائیوں سے محروم تھے۔ تاہم، اس کے بالکل برعکس، اس حکم نامے کی وجہ سے صوبے بھر کے شہریوں کے حقوق داؤ پر لگ سکتے ہیں۔

ایچ آر سی پی کی حالیہ فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ریاست اور کے پی کے عوام کے درمیان اعتماد کا شدید فقدان ہے: جن مقامی کمیونٹیوں سے ایچ آر سی پی نے ملاقاتیں کیں وہ پہلے سے ہی اس بات پر فکرمند ہیں کہ پتہ نہیں قانون کا نفاذ اور انصاف تک رسائی کون سی شکل اختیار کرے گی۔ انہوں نے مسلح افواج کی موجودگی میں حالیہ انتخابات کی شفافیت پر خدشات کا اظہار کیا اور وہ خارقمر واقعے کی شفاف تحقیقات نہ ہونے پر بھی ناخوش ہیں۔ نافذ کردہ حکم نامے سے ان خدشات کا مداوہ کسی بھی طرح نہیں ہوگا۔

کے پی میں امن وامان برقرار رکھنے کی بنیادی ذمہ داری کے پی حکومت پر عائد ہے اور یہ ذمہ داری اس انداز سے کسی اور ادارے کو منتقل نہیں ہونی چاہیے۔ ایچ آر سی پی کا کے پی کی حکومت سے پرزور مطالبہ ہے کہ وہ کے پی کے عوام کی امنگوں کا احترام کرے اور صوبے میں سویلین اداروں کی اتھارٹی اور استعداد بڑھانے پر توجہ دے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 18 ستمبر 2019]

پولیس کی زیرحراست ہلاکتیں باعث تشویش ہیں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے پولیس کی زیرحراست ملزمان کی ہلاکتوں کے کم از کم چار واقعات کا سخت نوٹس لیا ہے۔ اس سے پہلے اگست میں، ایچ آر سی پی نے میرپور خاص میں پولیس کی زیرحراست قتل کے دو ملزمان — دو ہندو لڑکوں — کو مبینہ تشدد کر کے قتل کیے جانے کی اطلاعات کی تحقیقات کی تھی۔ پنجاب میں، صرف گزشتہ ہفتے کے دوران زیرحراست ہلاکتوں کے تین واقعات پیش آئے ہیں۔ یہ واقعات لاہور، گجراں والا اور رحیم یار خان میں پیش آئے۔

مؤخرالذکر واقعہ، جس میں چوری کے ایک ملزم، ایک ذہنی طور پر معذور شخص، صلاح الدین ایوبی مبینہ حراستی تشدد کے باعث ہلاک ہو گیا تھا، قابل فہم طور پر شدید عوامی غم وغصے کا باعث بنا ہے۔ اس کے باوجود، پولیس کی حراست میں تشدد اور نارروا سلوک ایسی راسخ سرگرمیاں ہیں جو سب سے زیادہ 'قابل قبول' اور اس سے بھی بدتر یہ کہ، 'ضروری' سمجھی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہمیشہ تاخیر کی جاتی ہے حالانکہ پوسٹ مارٹم زیرحراست ہلاکت کے الزامات کے فوراً بعد ہونا چاہئے۔

ایچ آر سی پی پنجاب اور سندھ کے پولیس حکام سے ملاقات کر چکا ہے، اور اس نے اپنے اس موقف کو پھر سے دہرایا ہے کہ الزام کی نوعیت سے قطع نظر، تشدد اور ذلت آمیز، غیرانسانی یا تضحیک آمیز سلوک ناقابل قبول ہے۔ پنجاب کے حکام نے ایچ آر سی پی کو یقین دلایا ہے کہ وہ انسانی حقوق کے معیارات کو پولیس کے طریق ہائے کار کا لازمی حصہ بنانے کے لیے کمیشن

کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔

صلاح الدین ایوبی کی زیرحراست ہلاکت کی تحقیقات ایک مثبت اشارہ ہے، لیکن زیرحراست افراد کے ناقابل تنسیخ انسانی حقوق کے احترام کو پولیس کی تربیت اور انتظامی ڈھانچے کا حصہ بنانا ہوگا اور اسے ضروری وسائل فراہم کرنا ہوں گے تاکہ یہ مخالفین کی بجائے محافظین کے طور پر کام کر سکے۔ علاوہ ازیں، ان اقدامات کو ایک ایسے قابل نفاذ قانونی فریم ورک کی مدد حاصل ہونی چاہئے جو تشدد کو جرم قرار دے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جس پر ریاست کو مزید ٹال مٹول کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 04 ستمبر 2019]

احمد مصطفیٰ کانجو کو ان کے خاندان کے حوالے کیا جائے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو اس امر پر شدید تشویش ہے کہ سرائیکی نیشنل پارٹی کے ترجمان احمد مصطفیٰ کانجو کو ابھی تک بازیاب نہیں کیا جاسکا۔

ان کے اہل خانہ کے بقول، محترم کانجو کو سادہ کپڑوں اور وردی میں ملبوس سیکیورٹی فورسز کے اہلکاروں نے جنوری 2019 کے اوائل میں رحیم یار خان میں ان کے گھر سے اٹھایا تھا۔ محترم کانجو کے اغواء کے بعد سوشل میڈیا پر نامعلوم لوگوں کی جانب سے ان کے خلاف مذموم مہم شروع کر دی گئی جو اس حد تک چلی گئی کہ انہیں توہین رسالت کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ اس کے علاوہ ، ان کی بیمار والدہ، ان کی بیوی اور دو چھوٹے بچے محترم کانجو کے حال احوال سے لاعلمی کے کرب سے گزر رہے ہیں۔

محترم کانجو دوٹوک سیاسی آراء کے حوالے سے جانے جاتے ہیں اور ایچ آر سی پی اپنے اس مؤقف کو ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہے کہ سیاسی راستبازی کوئی جرم نہیں۔ اور اگر کسی فرد پر جرم کا الزام عائد ہے تو اس کے ٹرائل کے لیے قانونی ڈھانچہ پہلے سے موجود ہے۔ جبری گمشدگیوں کی اس نظام میں کوئی جگہ نہیں اور ان سے صرف خوف کی فضا میں ہی اضافہ ہو رہا ہے جو پاکستانی معاشرے کے لیے شدید نقصان کا باعث ہے۔

ایچ آر سی پی کا پرزور مطالبہ ہے کہ مسٹر کانجو کی جبری گمشدگی کے واقعے کی پوری طرح تحقیقات کی جائیں اور ان کے خاندان کو قابل بھروسہ معلومات فراہم کی جائیں۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 25 ستمبر 2019]

مزدوروں کو خرید و فروخت کی جنس تصور نہ کیا جائے

فیکٹریوں میں لیبر انسپکشن پر پابندی کے پنجاب حکومت کے فیصلے کو افسوسناک قرار دیتے ہوئے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے کہا ہے کہ یہ اقدام انتہائی بے رحم اور غیر دانشمندانہ ہے

ایک ایسے وقت میں جب ضرورت اس بات کی ہے کہ لیبر انسپکشن کا نظام زیادہ مضبوط کیا جائے اور معیشت کے تمام شعبوں پر لاگو کیا جائے، حکومت نے مزدوروں کی بہبود کو عملی لحاظ سے مسترد کر دیا ہے۔ ملک کے آئین کا آرٹیکل 37(ہ) کہتا ہے کہ ریاست 'کام کار کے مناسب اور انسان دوست حالات بنانے کے لیے انتظامات کرے گی"، جبکہ حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ آجر اپنی صنعتوں میں صحت و سلامتی کو یقینی بنانے کے پابند نہیں رہے۔ حکام کو بلدیہ فیکٹری کی آگ جیسے دلخراش واقعات سے سبق سیکھنا چاہیے مگر انہوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

معیشت کی صحت کا انحصار مزدوروں کی صحت اور سلامتی پر ہوتا ہے اور اس چیز پر بھی کہ ریاست اپنے آئینی و عالمی فرائض کی ادائیگی کے لیے کس حد تک تیار ہے۔ حکومت کو خود سے پوچھنا چاہیے کہ کیا وہ لیبر انسپکشن کی غیر موجودگی میں حفاظت سے متعلقہ واقعات کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہے۔ اس قسم کے اقدامات سے گریز کرنا چاہیے نہ صرف اس وجہ سے کہ ایک تجارتی پارٹنر کی حیثیت سے پاکستان کی ساکھ کو متاثر کرتے ہیں اور کاروباری مفادات کے خلاف ہیں، مگر اس وجہ سے کہ مزدوروں کی زندگیاں فطری طور پر بہت قیمتی ہیں اور انہیں خرید و فروخت کی اجناس تصور نہ کیا جائے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 13 ستمبر 2019]

انسانی حقوق سے متعلق پاکستان کے عالمی فرائض پر تربیتی ورکشاپ کا انعقاد

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے آج اسلام آباد میں انسانی حقوق سے متعلق پاکستان کے عالمی فرائض پر ایک تربیتی ورکشاپ منعقد کی ہے۔ فریڈرک نومن فاؤنڈیشن فار فریڈم کے تعاون سے ہونے والی ورکشاپ کا مقصد شرکاء کو پاکستان کے عالمی فرائض سے آگاہ کرنا تھا جو اس پر انسانی حقوق کے ان معاہدوں کی رو سے عائد ہیں جن کی پاکستان نے توثیق کر رکھی ہے، نیز انہیں عالمگیر سلسلہ وار جائزے جیسے انسانی حقوق کے نظاموں سے بھی روشناس کروانا تھا۔

ایچ آر سی پی کے خیبر پختونخوا چیپٹر کے وائس چیئر مسٹر کامران عارف نے اقوام متحدہ کے معاہدوں اور طریقہ ہائے کار کے تحت ریاست کے 'تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری' اور عالمی برادری کو جوابدہی کے تصور کے تناظر میں عالمی قانون کے تحت ریاست کے اقتدار اعلیٰ کے تصور میں ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی۔ اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہ اقوام متحدہ کو انسانی حقوق کا 'موجد' کہا جاسکتا ہے، انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ انسانی حقوق کا عالمی منشور کس طرح تیار ہوا اور اس کے بعد انسانی حقوق کے معیارات کا تعین ہوا تاکہ ان حقوق کے اطلاق کو یقینی بنایا جاسکے۔

ایذا رسانی کے خلاف یو این کے کنونشن کا ذکر کرتے ہوئے، مسٹر عارف نے بتایا کہ ایذا رسانی سے تحفظ حتمی حق ہے اور ایذا رسانی یا ظالمانہ، ذلت آمیز یا غیر انسانی سلوک کی کسی بھی حالت میں اجازت نہیں ہے۔ تاہم، یو این کیٹ کو پاکستان میں بہت کم سمجھا گیا ہے کیونکہ یہاں لوگوں کو ایذا رسانی اور تشدد کے درمیان فرق کا بہت کم پتہ ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 19 ستمبر 2019]

میں اپنی بیٹی کو روٹی دوں یا تعلیم

پاکستان میں لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹیں

اگر ہم تعلیم حاصل نہیں کرتے تو ہماری قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ربیعہ 23 سال ایک بیٹی کی تنہا ماں

کراچی جولائی 2017ء

2015ء میں تعلیم اور ترقی پر اوسلو سیمینار (Oslo Summit) میں پاکستان کو دنیا میں سب سے بدترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے ممالک میں شمار کیا گیا۔ جولائی 2018ء میں منتخب نئی حکومت نے اپنے منشور میں کہا کہ تقریباً 22.5 ملین بچے بنیادی تعلیم سے محروم ہیں، خاص طور پر لڑکیاں شدید متاثر ہیں۔ 32 فیصد پرائمری سکول جانے والی عمر کی لڑکیاں سکول نہیں جاتیں جبکہ 21 فیصد اسی عمر کے لڑکے بھی سکول نہیں جاتے۔ چھٹی جماعت تک 59 فیصد لڑکیاں سکول سے باہر ہیں۔ اس کے مقابلے میں 49 فیصد لڑکے سکول نہیں جاتے۔ نویں جماعت میں صرف 13 فیصد لڑکیاں سکول جاتی ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی سکول نہ جانے کی تعداد ناقابل قبول ہے۔ لیکن لڑکیاں بری طرح متاثر ہیں۔

سیاسی عدم استحکام، سکیورٹی فورسز کا حکومتی معاملات میں بہت زیادہ عمل دخل ہے، پُرتشدد بغاوت اور بڑھتی ہوئی نسلی و مذہبی کشیدگی نے پاکستان کے سماجی ماحول پر نقصان دہ اثر ڈالا ہے۔ یہ قوتیں حکومت کے بنیادی فرائض مثلاً خاص طور پر تعلیم سے توجہ ہٹا دیتی ہیں جس سے لڑکیوں کو سب سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ سکول سے باہر بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ملک بھر میں تعلیم میں صنفی بنیاد پر امتیاز نمایاں ہے لیکن بعض علاقوں میں اس کی حالت بدترین ہے، صوبہ بلوچستان میں خواتین کی تعلیم سب سے کم فیصد ہے۔ 15-2014ء میں 81 فیصد خواتین نے پرائمری تعلیم مکمل نہیں کی تھی جبکہ 52 فیصد لڑکوں نے یہ تعلیم مکمل نہ کی۔ 75 فیصد خواتین نے کبھی سکول کا منہ نہیں دیکھا جبکہ اس کے مقابلے میں مردوں کی تعداد 40 فیصد ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق خیبر پختونخواہ میں تعلیم کی شرح بلند رہی۔ لیکن اس کے باوجود صنفی امتیاز برقرار رہا۔ سندھ اور بلوچستان میں تعلیم کی شرح بلند رہی اور جنس کی بنیاد پر تفاوت بھی کم رہا جو کہ 14 سے 21 فیصد ہے۔

تمام صوبوں میں نسل در نسل خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم سے محروم رکھا گیا اور انہیں غربت میں دھکیلا گیا۔ اس رپورٹ کے لئے انٹرویو میں لڑکیوں نے تعلیم کے لئے اپنی خواہش کا بار بار اظہار کیا اور ان کے خوابوں کو تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے کچل دیا گیا۔

لڑکیوں کے لئے تعلیم تک رسائی کی کمی صنفی عدم مساوات کے مترادف ہے۔ ملک میں زچگی کے دوران اموات کی شرح ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد بشمول زنا، عصمت دری، عزت کے نام پر قتل، تیزاب پھینکنے کے واقعات، گھریلو تشدد، جبری شادی اور کم عمری کی شادی بھی شامل ہیں۔ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے اور سرکاری ردعمل ناکافی ہے۔ پاکستان کے سماجی کارکنوں کا اندازہ ہے کہ ہر سال تقریباً ایک ہزار ہلاکتیں عزت کے نام پر ہوتی ہیں۔ 21 فیصد کم عمر لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔

حکومت کے اپنی ذمہ داری پوری نہ کرنے کے ردعمل میں نظام تعلیم میں واضح تبدیلیاں آئیں۔ کیونکہ حکومت سرکاری سکولوں کے ذریعے مناسب معیارِ تعلیم فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بچوں کو لازمی اور مفت تعلیم دینے میں بھی ناکام رہی ہے۔ جس کے نتیجے میں نئے نجی سکولوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ جن میں معیار کے لئے کوئی ضابطے نہیں ہیں۔ بہت سے غریب لوگوں کے لئے سرکاری سکولوں تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے سستے نجی سکولوں کے لئے مارکیٹ میں تیزی آ گئی ہے۔ بہت سے علاقوں میں غریب خاندانوں کے لئے سستے نجی سکول ہی تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں۔ اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے کم تعلیم یافتہ جن کو تھوڑی تنخواہ دی جاتی ہے ہی ایک متبادل ذریعہ ہے۔ جس میں حکومت کی کوئی مناسب نگرانی نہیں ہوتی نہ ہی اچھے معیار کی یقین دہانی کرائی جاتی ہے۔ دوسرا، مذہبی تعلیم کی فراہمی میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا۔ ان میں باقاعدہ مدرسے کے علاوہ غیر رسمی طور پر جہاں بچے ہمسایوں کے گھر قرآن کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مذہبی سکول اکثر غریب خاندانوں کے لئے دستیاب تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں تاہم یہ مناسب متبادل نہیں ہے کیونکہ وہ غیر مذہبی مضامین کی تعلیم نہیں دیتے۔

پاکستان میں حکومتی ڈھانچہ غیر معمولی طور پر مقامی طور پر خودمختار ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی کے بارے میں بہت سے فیصلے علاقائی سطح پر کیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً ہر صوبے مختلف اوقات پر مختلف نقطہ نظر کے ذریعے لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کے لئے مختلف منصوبہ بندی پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے کے ساتھ بڑے اختلافات کی طرف اشارہ کرتا ہے بشمول اس طرح کے بنیادی مسائل کے۔ آیا بچوں کو سرکاری سکولوں میں پڑھنے کی فیس ادا کرنا ہوگی یا اساتذہ کو کتنی تنخواہ دی جائے گی۔ تاہم ہر صوبے میں صنفی تفاوت موجود ہے۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جو سکول نہیں جاتے ان کی شرح بھی بہت بلند ہے۔ حکومت کی جانب سے تعلیمی نقطہ نظر میں واضح خامیاں موجود ہیں۔

سکول کے نظام کے اندر لڑکیوں کی تعلیم کے لئے رکاوٹیں

لڑکیوں کی تعلیم میں بہت سی رکاوٹیں تعلیمی نظام کے اندر موجود ہیں۔ پاکستان کی حکومت نے ابھی تک ملک کے بچے خاص طور پر لڑکیوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مناسب تعلیمی نظام نہیں بنایا۔ نجی سکولوں اور مذہبی مدرسوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داریاں منتقل کرنا ایک حل سمجھا جاتا ہے لیکن اس سے حکومت اپنی ان ذمہ داریوں سے مبرا نہیں ہو سکتی جن کے تحت وہ بین الاقوامی اور ملکی قوانین کے تحت تمام بچوں کو مناسب تعلیم دینے کی پابند ہے۔ لیکن حکومت پاکستان اس کو دینے میں ناکام ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اس رپورٹ میں انٹرویو دیتے ہوئے بہت سے لوگوں نے بتایا کہ معاشی طور پر کم تر طبقے کی لڑکیوں کے لئے تعلیم کی بڑھتی ہوئی طلب میں اضافہ ہوا ہے۔

تعلیمی سرمایہ کاری میں کمی

حکومت سکولوں میں بہت کم سرمایہ کاری کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم کی تعلیم پر سفارشات کے مقابلہ میں پاکستان بہت کم خرچ کر رہا ہے۔ بہت سے ماہرین تعلیم نے پاکستان میں صورت حال بیان کرتے ہوئے کہ حکومت تعلیم کے

معاملے میں عدم دلچسپی رکھتی ہے جو کہ قومی، ریاستی اور مقامی سطحوں پر واضح ہے۔

تمام بچوں کے لئے کافی تعداد میں سرکاری سکول موجود نہیں ہیں۔ سرکاری سکولوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی بچوں کو محفوظ طریقے سے اور مناسب وقت میں سکولوں تک نہیں پہنچایا جا سکتا۔ دیہی علاقوں میں صورت حال اس سے بدتر ہے۔ جہاں سکولوں کی تعداد بھی کم ہے اور نجی سکول بھی اس خلا کو پُر نہیں کر سکتے۔ وہ خاندان جو سرکاری سکولوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں سمجھتے ہیں کہ بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

بچوں خاص طور پر لڑکیوں کے لئے جب وہ بڑی ہو جاتی ہیں رکاوٹیں بڑھ جاتی ہیں۔ ثانوی سکولوں کی تعداد پرائمری سکولوں کے مقابلے میں کم ہے اور کالجوں کی مزید کم خاص طور پر لڑکیوں کے لئے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے سکول اور کالج بھی علیحدہ علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے سکول اور کالجوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلے میں کم ہے، بہت سی لڑکیوں کو تعلیم کو جاری رکھنے سے روک دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ ایک سکول کی تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد دوسرے سکول تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔

مہنگی تعلیم

غریب گھرانوں کو بچوں کو سکول بھیجنے کے لئے بہت سی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ سرکاری سکول نجی سکولوں کے مقابلے میں سستے ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ٹیوشن فیس، رجسٹریشن فیس اور امتحانی فیس طلب کرتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ طالب علموں کو اضافی بل بھیج دیتے ہیں۔ ان میں کتابیں، کاپیاں، یونیفارم، جوتے اور سکول بیگ شامل ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ درسی کتب سرکاری سکولوں میں مفت مہیا کی جاتی ہیں لیکن بعض دفعہ طلبا کے گھر والوں کو ان کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔

بہت سے غریب خاندان جو سرکاری سکولوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے کے پاس سرکاری سکولوں کے نظام سے باہر ذریعہ تعلیم چننے کا اختیار رہ جاتا ہے۔ ان میں نجی سکول، غیر رسمی تدریسی مراکز، غیر سرکاری تنظیموں (این جی او) کے سکول بچوں کے والدین کے لئے ایک پیچیدہ نظام پیش کرتے ہیں۔ بہت سی لڑکیاں ان میں سے تمام تعلیمی اداروں کا تجربہ بغیر کسی تعلیمی قابلیت کے کرتی ہیں۔

فرسودہ معیارِ تعلیم

بہت سے گھرانوں نے ان کو دستیاب تعلیم کے معیار کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ کچھ کہتے ہیں معیارِ تعلیم اتنا فرسودہ ہے کہ بچے کو بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سرکاری سکولوں میں بھیجنے والے طلبا کے والدین شکایت کرتے ہیں۔ اساتذہ سکول میں شاذ و نادر آتے ہیں اور طلبا کی بھرمار ہوتی ہے۔ سہولیات ناقص ہیں۔ نجی سکولوں میں خاص طور پر سستے نجی سکولوں میں اساتذہ نیم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ان کے لیکچر بھی غیر منظم اور ناقص ہوتے ہیں۔ سرکاری اور نجی سکولوں کے اساتذہ سکولوں سے باہر کی پرائیویٹ اکیڈمی کے تعلیم کے لئے دباؤ ڈالتے ہیں۔ اس کے اضافی اخراجات بھی والدین کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ سرکاری اور نجی سکولوں میں اساتذہ کی طرف سے جسمانی سزا اور بدسلوکی کی بھی وسیع پیمانے پر شکایات ملی ہیں۔

لازمی تعلیم کے اطلاق کا فقدان

پاکستان میں بہت سے بچے اس وجہ سے سکول نہیں جاتے کہ 'تمام بچوں کو پڑھنا چاہیے' پر حکومتی سطح پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ آئینِ پاکستان کا کہنا ہے ہر پاکستانی 5 سے 16 سال تک کے بچے کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنی چاہئے۔ جس کے لئے قانون سازی کی جائے گی۔ تاہم کسی بھی صوبے میں حکومت کی طرف سے کوئی منظم کوششیں نہیں کی گئیں جو اس بات کی یقین دہانی کرائے کہ تمام بچے سکول جائیں گے۔

جب بچہ سکول میں فیل ہو جاتا ہے تو کئی دفعہ اساتذہ انفرادی طور پر بچے کو پڑھائی جاری رکھنے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے منظم طریقہ کار نہیں ہے۔ جیسے بچوں کا سکول میں دوبارہ داخلہ وغیرہ کروانا۔ اس سے بین الاقوامی معیار کی خلاف ورزی ہوتی ہے جس پر پاکستان نے دستخط کیے ہیں جس کے تحت کم از کم مفت اور لازمی پرائمری تعلیم ضروری ہے۔

بدعنوانی

بدعنوانی سرکاری سکولوں کے نظام میں ایک اہم مسئلہ ہے جو کہ کئی شکلوں میں موجود ہے۔ اساتذہ اور پرنسپلوں کی بھرتی میں وسیع پیمانے پر رشوت اور اقربا پروری ہوتی ہے۔ کچھ لوگ ٹیچر کا عہدہ خریدتے ہیں اور دوسرے سیاسی تعلقات کی وجہ سے نوکری حاصل کرتے ہیں۔ جب لوگ تدریس کے عہدوں کو غیر قانونی طور پر حاصل کرتے ہیں وہ نہ تو پڑھانے کے قابل ہوتے ہیں اور نہ ہی وہ طلبا کو متحرک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں نہ ہی ان سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر دیہی علاقوں میں کچھ سکول خالی ہوتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کے ماہرین کے مطابق رشوت کی بنا پر اساتذہ کی تنخواہ کسی ایسے شخص کو دی جاتی ہے جو تعلیم نہیں دیتا۔

سکول کے نظام سے باہر لڑکیوں کی تعلیم میں رکاوٹیں

سکول کے نظام میں رکاوٹوں کے علاوہ لڑکیوں کو اپنے گھروں اور برادری میں بھی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں غربت، چائلڈ لیبر (بچوں سے مشقت) جنسی امتیاز تکلیف دہ سماجی رویے اور سکول کے پُرخطر اور دیگر خطرات شامل ہیں۔

غربت

بہت سے والدین کے لئے بچوں کو سکول بھیجنے کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ غربت ہے۔ یہاں تک نسبتاً کم اخراجات بھی وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں بہت سے غریب خاندان ہیں۔ 2016ء میں حکومت کے اندازے کے مطابق چھ کروڑ افراد غربت کا شکار ہیں جو کہ ملک کی کل آبادی کا 29.5 فیصد ہے۔

لڑکیوں سمیت بہت سے بچے اس لئے سکول سے باہر ہیں کیونکہ وہ مزدوری کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کو اپنے کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے لیکن لڑکیاں اکثر گھریلو صنعتوں موتی تارا لگانا، چیزوں کو جوڑنا، کڑھائی سلائی کا کام کرتی ہیں۔ دوسرے بچے جن میں سے اکثریت لڑکیوں کی ہے گھریلو کاموں کے لئے ملازمہ کے طور پر کام کرتی ہیں۔

سماجی اقدار

کچھ خاندان اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ایک خاص عمر کے بعد بچیوں کو تعلیم حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ مختلف برادریوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے بارے رویہ واضح طور پر مختلف ہوتا ہے۔ کچھ خاندانوں میں لڑکیوں کی تعلیم برادری کے دباؤ، ثقافتی معیار کی خلاف ورزی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ جب خاندان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے برادری کے قوانین کے خلاف جاتے ہیں تو لڑکیوں کو سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم کچھ قدامت پسند خاندان بھی لڑکیوں کے تعلیم کے بڑھتے رجحان کی حمایت کرتے ہیں۔ حکومت کو ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

لڑکیوں کے بلوغت کی عمر پر پہنچنے پر اکثر کو سکول سے اٹھا لیا جاتا ہے کیونکہ ان کے خاندانوں کو ان کے رومانوی تعلقات میں ملوث ہونے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ کچھ خاندان اس بات سے خوفزدہ ہوتے ہیں کہ بڑی عمر کی لڑکیوں کو سکول آتے جاتے راستے میں جنسی طور پر ہراساں کیا جائے گا۔ نقصان دہ جنسی اقدار بھی لڑکوں کو تعلیم دینے کی ترجیح کا باعث بنتے ہیں۔ کیونکہ لڑکیاں عام طور پر اپنے سسرال کے ساتھ رہتی ہیں اور اپنے شوہر کے خاندان کا بھی ہاتھ بٹاتی ہیں جبکہ بیٹوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہیں گے لہٰذا بیٹوں کو سکول بھیجنے کو بہتر سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے۔

کم عمری کی شادی لڑکیوں کو سکول نہ بھیجنے کی وجہ بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ پاکستان میں 21 فیصد لڑکیوں کی شادیاں اٹھارہ سال کی عمر سے پہلے کر دی جاتی ہیں اور تین فیصد کی پندرہ سال کی عمر سے پہلے۔ لڑکیوں کو ان کے بلوغت کی عمر تک پہنچتے ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ شادی کے قابل ہو چکی ہیں اور کچھ برادریوں میں کم عمری کی شادی کی توقع کی جاتی ہے۔ بعض خاندان غربت کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کی شادی کر دیتے ہیں اور بعض اس بات سے خوفزدہ ہو کر جلد شادی کر دیتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی مرضی سے شادی نہ کر سکیں۔ سکول میں پڑھنے والی لڑکیوں کو شادی دیر سے کرنے میں مدد ملتی ہے اور جونہی لڑکیوں کی شادی یا منگنی ہو جاتی انہیں سکول چھوڑنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہے۔

عدم تحفظ

بہت سے خاندان اور لڑکیاں عدم تحفظ کو تعلیم جاری رکھنے میں

رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ان میں کئی قسم کے تحفظ کا مثلاً جنسی ہراسگی، اغوا، جرم، تنازعات اور تعلیم پر حملے شامل ہیں۔ کچھ خاندانوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ حالیہ سالوں میں صورت حال مزید خراب ہوگئی ہے۔ چھوٹے بچوں کو اپنے بڑے بہن بھائیوں کی نسبت تعلیم تک رسائی کم ہے۔

خاندان مصروف سڑکوں کی وجہ سے پریشان ہیں۔سکول دور ہونے کی وجہ سے لڑکیوں میں دوران سفر خطرات اور خوف کا اضافہ ہوا ہے۔ بہت سی لڑکیوں کو سکول کے راستے میں جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے جبکہ پولیس اس ہراسگی سے بچانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کرتی۔لڑکیاں ہراسگی کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ انہیں ہی موردالزام ٹھہرایا جائے گا یا پھران کے والدین انہیں سکول سے ہٹالیں گے۔

لڑکیوں اوران کے خاندانوں کو اغوا کا خطرہ درپیش ہوتا ہے اوراس میں سکول کے طویل راستے خطرے کو بڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔اس خوف میں اس وقت اضافہ ہوجاتا ہے جب لڑکیاں جوان ہوں اوران پر جنسی حملے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پاکستان میں تعلیم پر حملے پریشان کن حد تک عام ہیں۔ جب تشدد کے واقعات سکول یا اس کے اردگرد وقوع پذیر ہوتے ہیں تو لڑکیوں کی تعلیم پر اس کے نتائج دوررس ہوتے ہیں۔

ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے خاندانوں نے تشدد کے واقعات کے بعد کئی سالوں تک بچیوں کے سکول نہ جانے کی وجہ قرار دیا۔

سکول مسلح حملوں کی زد میں

پاکستان کے بہت سے حصوں میں بغاوت، نسلی اور مذہبی تنازعات سے متعلق تشدد کی سطح میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے لڑکیوں کی تعلیم تک رسائی پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اور نسلی تنازعات بھی اکثر سکولوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ پاکستان میں حملوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے ان میں طلبا، اساتذہ اور سکولوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

پاکستان میں حالیہ برسوں میں تعلیم پر سب سے زیادہ تباہ کن حملہ دسمبر 2014ء میں آرمی پبلک سکول پشاور پر ہوا تھا۔ جہاں عسکریت پسندوں نے 145 افراد کو ہلاک کیا جو کہ تقریباً تمام بچے ہی تھے۔ یہ حملہ دوسرے حملوں سے مختلف نہ تھا۔ 2013ء سے 2017ء کے دوران سینکڑوں سکولوں پر حملے کیے گئے۔عام طور پر دھماکہ خیز مواد کے ساتھ جس سے کئی سو طلبا اور اساتذہ ہلاک ہوئے اوراس سے بنیادی ڈھانچے کو بہت نقصان پہنچا۔ ان حملوں میں سے ایک تہائی نے خاص طور پر لڑکیوں اور خواتین کو نشانہ بنایا۔ان کا مقصد ان کی تعلیم میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔

پاکستان سکولوں کے نظام کو درست کرسکتا ہے اور ایسا کرنا بھی چاہئے۔حکومت کو تعلیم کے لئے مزید سرمایہ کاری کرنی چاہئے اور ان مسائل کو عدم مساوات سے نمٹنے کے لئے استعمال کرنا اور یقینی بنانا چاہئے تاکہ تمام بچوں، لڑکوں اور لڑکیوں کو اعلیٰ معیار کی پرائمری اور ثانوی تعلیم حاصل ہوسکے۔ کیونکہ ملک کے مستقبل کا انحصار اس پر ہے۔

بنیادی سفارشات
وفاقی حکومت کے لیے

☆ یونیسکو (UNESCO) کی سفارشات کے مطابق تعلیم پر اخراجات میں اضافہ تاکہ حکومت تعلیم کے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرسکے۔

☆ صوبائی تعلیم کے نظام کی نگرانی کو مضبوط بنایا جائے۔تاکہ لڑکے اور لڑکیوں کے پرائمری اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مساوی بنائے جاسکیں۔صوبے لڑکیوں کی تعلیم کی بابت صحیح اعداد وشمار فراہم کریں، ان کے داخلے کے اندراج کی صحیح نگرانی، لڑکیوں کی حاضری کی مناسب نگرانی کی جائے اور ہر صوبے میں اس بابت اہداف مقرر کیے جائیں۔

☆ تعلیم مہیا کرنے کے حوالے سے مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کی مدد کریں۔صنفی عدم مساوات کو ختم کیا جائے۔

☆ صوبائی حکومتوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے تاکہ سرکاری سکولوں میں معیارِ تعلیم کو بہتر بنایا جائے اور نجی سکولوں میں معیار کو یقینی بنایا جائے۔

☆ بغیر کسی استثنیٰ کے شادی کے لئے قومی عمر کم ازکم 18 سال تک بڑھائی جائے اور کم عمری کی شادیوں کا خاتمہ کیا جائے تاکہ 2030ء تک ہر قسم کی چائلڈ میرج کو ختم کیا جا سکے۔

☆ محفوظ سکول اعلامیہ کی توثیق اور عمل درآمد بین الاقوامی سیاسی معاہدے کے مطابق کیا جائے تاکہ اساتذہ اور طلبا کو مسلح حملوں سے تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

صوبائی حکومتوں کے لئے

☆ صوبائی تعلیمی حکام کو ہدایت کی جائے کہ لڑکیوں کی تعلیم کو تعلیمی بجٹ میں ترجیح دی جاے، تاکہ سکولوں کی تعمیر، خواتین اساتذہ کی بھرتی اور ٹریننگ، سامان کی فراہمی اور لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم کے درمیان عدمِ توازن کو درست کیا جاسکے۔

☆ بچوں کے لیبر قوانین کا نفاذ کرنے میں مدد کی جائے۔

☆ پولیس اہلکاروں کو سکولوں کے ساتھ طالب علموں کی حفاظت یقینی بنانے کی ہدایت دیں جن میں اساتذہ، طلبا اور سکولوں کو ممکنہ خطرات سے تحفظ دینے اور خاص طور پر لڑکیوں کو ہراساں کرنے سے روکنے کے لئے کام کرنا چاہئے۔

☆ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ سرکاری ایجوکیشن اہلکاروں کی بدعنوانی کو روکنے والوں کے لئے موثر طریقہ کار بنایا جائے۔

صوبائی تعلیمی حکام کے لیے

نئے سکول خاص طور پر مخلوط تعلیم اور لڑکیوں کے لئے تعمیر کئے جائیں۔

جب تک سرکاری سکول دستیاب نہیں ہیں، سرکاری سکولوں سے دور رہنے والی لڑکیوں کو نجی سکولوں میں وظائف فراہم کیے جائیں۔

طالب علموں کو مفت اور سستی ٹرانسپورٹ فراہم کرے۔ جو طویل فاصلے اور مشکل ماحول میں ان کو سرکاری سکولوں تک لے جائے۔

سرکاری سکولوں میں تمام رجسٹریشن فیس اور امتحانات فیس کو ختم کرے۔

غریب طالب علموں کو سکول یونیفارم، بیگ، جوتے، درسی کتب اور تمام ضروری اشیاء مہیا کی جائیں۔

تمام پرنسپلوں کو ان علاقوں سے جن سے بچے ان کے سکولوں میں پڑھتے ہیں ہدایت کی جائے کہ وہ ایسے بچوں کی نشاندہی کریں جو سکول سے باہر ہیں۔ان کو چاہئے کہ وہ ان کے خاندانوں کے ساتھ مل کر انہیں سکول میں لے جانے کے لئے کام کریں۔

غریب خاندانوں کی لڑکیوں کے لئے حاضری میں اضافے کے لئے وظائف، کھانے کی تقسیم یا کھانے کے پروگراموں کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔

جب بچے سکول چھوڑتے ہیں یا غیر حاضر ہوجاتے ہیں تو تمام سکولوں کو چاہئے کہ وہ ان وجوہات کا تعین کرنے اور طالب علموں کو دوبارہ سکول میں واپس لانے کے لئے کوشش کریں۔

ہر سکول کو چاہئے کہ وہ سکیورٹی کا منصوبہ تیار کرے اور اس کو نافذ کرنے کے لئے توجہ دیں خاص طور پر لڑکیوں کی جنسی ہراسگی کے خدشات پر۔

سرکاری تعلیم کے نظام کے ذریعے لڑکیوں کے لئے مڈل اور ہائی سکول تک رسائی کو بڑھانے کے لئے منصوبہ تیار کرے جس میں نئے سکولوں کو قائم کرنا بھی شامل ہو۔ تمام سکولوں کی نگرانی اور معیار کو یقینی بنایا جائے جس میں صرف سرکاری سکول ہی نہیں بلکہ نجی سکول اور مدرسے بھی شامل ہیں۔سکولوں میں ہر قسم کی جسمانی سزا کی ممانعت کریں اور اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والے ملازم کے خلاف مناسب انضباطی کارروائی کریں۔

اس بات کو یقینی بنایا جائے تاکہ تمام سکولوں میں حفظان صحت کی سہولیات کے ساتھ ساتھ محفوظ اور صاف باتھ روم، پینے کا صاف پانی اور چاردیواری موجود ہو۔

(انگریزی سے ترجمہ، ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ۔
پاکستان: تعلیم سے محروم بچیاں کا خلاصہ)

جیل کے نظام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے

آئی۔اے۔رحمان

20 کروڑ یا اس سے زائد کی بدعنوانی پر نیب قانون کے تحت سزا یافتہ افراد کو اے کلاس جیل کے بجائے سی کلاس جیل میں ڈالنے سے متعلق وفاقی حکومت کا فیصلہ کسی بھی کسوٹی پر پرکھا جائے تو درست معلوم نہیں ہوگا۔

اس حوالے سے سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ یوں امتیازی نظام وجود میں آئے گا۔ جہاں نیب مقدمات میں ملزمان و مجرمان سے سی کلاس جیل کے مطابق سلوک روا رکھا جائے گا وہیں دیگر قوانین کے تحت چلنے والے مقدمات میں سزا یافتہ افراد یا ملزمان پہلے کی طرح بہتر کلاس کی سہولیات سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

ایک اور اہم بات یہ کہ مقدمات کا سامنا کرنے والوں کے ساتھ اس وقت تک بے گناہ شہری جیسا برتاؤ رکھنا لازمی ہے جب تک کہ وہ گناہ گار ثابت نہیں ہوجاتے، اور ان کے ساتھ مجرموں کی طرح پیش آنا تو بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔

چونکہ بڑی بڑی کرپشن کے الزام میں گرفتار افراد حکومت کے سیاسی مخالفین ہیں، اس لیے یہ اقدام سیاسی انتقامی لڑائی کے آثار کو نمایاں کرتا ہے۔ حکومتی ترجمان کئی موقعوں پر اپنی اس خواہش کا اظہار کرچکے ہیں کہ وہ کرپٹ سیاستدانوں کے قید و بند کے حالات ناقابلِ برداشت حد تک سخت بنا کر سزا دینا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی معقول ذہن اس قسم کے خیالات کو فرسودہ ذہنیت کا خلل قرار دے کر مسترد کرے گا۔

موجودہ تجویز جیل مینوئل پر نظرِ ثانی کی غیر مربوط کوششوں کے نتیجے میں پیش کی گئی ہے تاہم عقلمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جیل اصلاحات کے معاملے پر غیر منظم و جانبدارانہ انداز میں مرحلہ وار نہیں بلکہ جامع انداز میں جائزہ لیا جائے۔

بدقسمتی سے ریاستِ پاکستان نے آزادی کے تازہ جذبے سے سرشار ہوکر جس انتقامی انصاف کو اپنایا تھا وہ گزشتہ دہائیوں کے دوران مزید بدتر ہوا ہے۔

نوآبادیاتی دور کے ابتدائی مرحلوں کے دوران ہمارے برِصغیر میں عقوبت خانے نما جیل خانے موجود تھے جنہیں ماقبل نوآبادیاتی دور میں جاگیردار سرداروں نے قائم کیا تھا۔ پھر کچھ جیلوں میں تشدد کا نشانہ بننے والے سیاسی کارکنان کی جانب سے چلائی جانے والی جیل اصلاحاتی مہم کی مہربانی اور کچھ عالمی برادری کی جانب سے قیدیوں کے حقوق کو انسانی حقوق کے برابر قرار دینے والے آزادی پسند خیالات کو اختیار کیے جانے کی وجہ سے برِصغیر میں بھی ان تصورات کو تسلیم کیا جانے لگا۔

برطانوی راج کے دو اقدام قابلِ ذکر ہیں۔ پہلا یہ کہ انہوں نے 'جرائم پیشہ' قبائل کہلائے جانے والوں کو غیر قانونی سرگرمیاں ترک کرنے کی ترغیب دینے کی کوشش میں کالونی کے علاقوں میں کھیتی کے لیے زمینیں الاٹ کیں۔ لیکن آزادی کے بعد یہی زمینیں ان سے لے کر طاقتور بیوروکریٹس کو دے دی گئیں۔ یوں 'جرائم پیشہ' افراد کو قانون کے پاسدار کسان میں بدلنے کی یہ اسکیم رائیگاں گئی۔

دوسرا قابلِ ذکر اقدام یہ تھا کہ انہوں نے کھلی جیلیں قائم کیں، ان میں سے ایک لاہور کے قریب واقع مناواں کے مقام پر بنائی گئی اور دوسری سندھ کے ضلع بدین میں تعمیر کی گئی۔

ان دونوں جیلوں میں ایک وسیع رقبے پر پھیلی زمین الاٹ کی گئی تاکہ قیدیوں سے کاشتکاری کا کام لیا جائے۔ جس انداز میں اس منصوبے کو تہ و بالا کیا گیا وہ کسی طور پر بھی ملکی تاریخ کے ایک مایوس کن باب سے کم نہیں ہے۔

> بیرکوں میں چھت کے پنکھے لگانے سے لے کر اہلِ خانہ سے ملاقاتوں میں آسانیاں پیدا کرنے تک جیل اصلاحات کے اس پورے عمل کے دوران یہی خیال غالب رہا کہ چاہے بد سے بدتر مجرم کیوں نہ ہو لیکن انسان ہونے کے ناطے ان کا پیدائشی وقار قائم رہنا چاہیے۔

لاہور میں واقع کوٹ لکھپت جیل بھی کسی حد تک کھلی جیل کی طرز پر ڈیزائن کی گئی تھی۔ تجویز یہ تھی کہ وہاں قیدی قید خانوں سے باہر آسکتے ہوں اور دکانوں سے مشروبات، سگریٹس یا اسنیکس خرید سکیں تاکہ انہیں تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع مل سکے۔ مگر ایسا ہو نہیں پایا۔

بیرکوں میں چھت کے پنکھے لگانے سے لے کر اہلِ خانہ سے ملاقاتوں میں آسانیاں پیدا کرنے تک جیل اصلاحات کے اس پورے عمل کے دوران یہی خیال غالب رہا کہ چاہے بد سے بدتر مجرم کیوں نہ ہو لیکن انسان ہونے کے ناطے ان کا پیدائشی وقار قائم رہنا چاہیے۔

مہذب معاشرے نہیں چاہتے کہ پہلی بار قانون کو ہاتھ میں لینے والے جیل کے بُرے حالات کے باعث سخت گیر مجرم بن جائیں۔ نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ غلط کام کرنے والوں کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔

اس کے برعکس ان کی خواہش یہ ہوگی کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کتھارسس (ایک ایسا عمل ہے جس میں انسان اپنے دبے ہوئے شدید جذبات و احساسات کا کسی صورت میں اظہار کرکے ذہنی سکون، تطہیر اور تجدید حاصل کرتا ہے) کے عمل سے گزریں اور اپنے اذہان کو مجرمانہ خیالات سے پاک کریں۔

پاکستان میں موت کی سزا پانے والے کئی قیدی کا آمد شہریوں میں تبدیل ہوگئے تھے لیکن اس قدر تبدیلی کے باوجود بھی انہیں پھانسی پر ہی لٹکایا گیا۔

افریقہ کے نسلی عصبیت کی بنیاد پر قائم نظام میں سیاہ فام افریقیوں کی زندگی یا آزادی کا کوئی احترام نہیں تھا تاہم ویران جزیرے روبن میں واقع جس جیل کے قید خانے میں نیلسن منڈیلا کو رکھا گیا تھا وہاں بنیادی سہولیات فراہم کی گئیں تھیں۔ ان سہولیات میں پلنگ، میز اور ایک ایسی کھڑکی کی سہولت موجود تھی جہاں سے آسمان کو دیکھا جاسکتا تھا، یعنی وہ سبھی سہولیات جو آج حکومتِ پاکستان مخصوص درجے کے قیدیوں کو فراہم نہیں کرنا چاہتی۔

لہٰذا ملک کی جیلوں کو مغلیہ دور کے تہہ خانوں میں تبدیل کرنے کے بجائے جامع جیل اصلاحاتی منصوبے پر کام کرنا چاہیے۔ اس کا پہلا کام قیدیوں کی تعداد میں کمی ہونی چاہیے، اس مقصد کے لیے مقدمات کا سامنا کرنے والے ایسے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد کو ضمانت پر رہائی دی جائے جو قید میں رکھے جانے کے مستحق ہی نہیں ٹھہرتے۔

اس موضوع پر 18-2017ء میں ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے قومی انسداد دہشتگردی کے ادارے اور کوڈ (سول سوسائٹی کا ایک ادارے) سی او ڈی ای کے تعاون سے ایک بہت ہی نمایاں تحقیقی کام کیا۔

Addressing Overcrowding in Pakistan by Reducing Pre-Conviction-in Pakistan کے عنوان سے شائع ہونے والی یہ تحقیق وفاقی اور صوبائی نظامِ فوجداری انصاف، جیل افسران، عدالتی حکام، بار کونسلز، اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور سول سوسائٹی کے ماہرین کی پیش کردہ تجاویز پر مبنی ہے۔

اس تحقیق کے مطابق یکم اکتوبر 2017ء تک (سابقہ فاٹا کے علاوہ) ملک کی جیلوں میں 53,744 قیدیوں کی باضابطہ گنجائش کے بجائے 84,287 قیدی مقید ہیں۔ تحقیق جیل کی گنجائش کا حساب لگانے کے طریقہ کار پر سوال کھڑا کرتی ہے، اگر رپورٹ میں بتائے گئے جیل کی گنجائش کے حسابی فارمولے کو اختیار کیا جائے تو اضافی قیدیوں کی شرح اور بھی زیادہ بن جاتی ہے۔

رپورٹ کے مطابق جیل میں موجود 66 فیصد قیدیوں کے مقدمات عدالت میں زیرِ سماعت ہیں۔ جیسا کہ سپریم کورٹ بھی یہ معاملہ زیرِ غور لائی ہے کہ جہاں قانونی گنجائش موجود ہے وہاں بھی ضمانت سے انکار کردیا جاتا ہے، اس کے پیچھے دراصل وہ انتقام جوئی کا کلچر کارفرما ہے جو حکام کی راہداریوں میں غالب ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ضمانت پر رہائی کو زیادہ تر مقدمات میں بنیادی حق کی حیثیت دی جائے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ غلط کام کرنے والوں کی مجرمانہ شدت میں اضافے اور دہشتگردوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر قیدیوں سے انسان دوستی کے فلسفے کو ایک طرف رکھنا ہوگا۔

اس دلیل پر انحصار کرنا غلط اور خطرناک ثابت ہوگا کیونکہ اس طرح اس خیال کو تقویت ملے گی کہ ریاست اپنے خیر اندیش فرائض ترک کرچکی ہے اور پہلے کے مقابلے میں زیادہ پُرتشدد اور استحصالی بن چکی ہے۔

ذمہ دار اور جوابدہ گورننس کی راہ پر لوٹنے کے لیے ریاست کو ایک بار پھر عقل و شعور اور اتفاقِ رائے کے تحت نظامِ حکومت چلانا ہوگا اور عوام بشمول قیدیوں کو بنیادی حقوق سے محروم کیے بغیر تشدد اور دہشتگردی کا مقابلہ کرنا سیکھنا ہوگا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

کانجو محلّے کے بلونگڑے

حارث خلیق

مجھے بلّیاں پسند نہیں۔ بلونگڑوں سے بھی کوئی خاص رغبت نہیں۔ انگریزی میں جیسے کہتے ہیں: "I am not a cat person"۔ مگر جب رحیم یار خان کے کانجو محلّے کے ایک گھر میں بلونگڑوں کو ماری جانے والی ٹھوکروں کے بارے میں کسی نے بتایا تو پریشانی ہوئی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بلّی اس وقت اپنے بلونگڑوں کو لے کر گھر میں کسی محفوظ جگہ منتقل ہو جاتی ہے جب ایک سات سالہ بچّے کا اسکول سے واپسی کا وقت ہوتا ہے۔ وہ بچّہ غصّے سے بھرا گھر کے صحن میں داخل ہوتا ہے اور بستہ پھینک کر اگر کوئی بلونگڑا بلّی کے پہلو میں نظر آئے تو اسے ٹھوکریں مارتا ہے۔ یہ بچّہ پہلے بالکل ایسا نہیں تھا مگر چند ماہ سے اس کا غصّہ بڑھتا جا رہا ہے۔ روتا، چیختا تو اس کا چھوٹا بھائی بھی ہے جو چھ سال کا ہے مگر یہ بچّہ بلونگڑوں کو بلّی کے ساتھ دیکھ کر مشتعل ہو جاتا ہے۔

ہمارے محافظ اداروں کے اہل کار جن میں سے کچھ کی قمیصوں پر انگریزی میں ''بے خوف'' لکھا تھا، بڑی بے خوفی سے رات کے پچھلے پہر ان بچّوں کے باپ کو گھر سے اٹھا کر لے گئے۔ یہ جنوری 2019ء کی ایک سَرد شب تھی اور تب سے خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس دوران عدالتی کارروائی بھی ہوئی اور جبری گمشدگیوں کے سرکاری کمیشن میں شُنوائی بھی۔ ابھی دو، ایک ہفتے قبل ایک سرکاری اہل کار نے ان بچّوں کے رشتے کے چچا کو فون کر کے یہ بھی بتایا کہ ان کے باپ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مگر وہ گھر نہیں پہنچا۔ اس دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ ان بچّوں کے باپ کو تحویل میں لینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس نے سوشل میڈیا پر اشتعال انگیز مواد مشتہر کیا۔ مگر سیانے یہ بھی کہتے ہیں کہ اصل سبب اس جواں سال آدمی کی سیاسی وابستگی ہے۔ یہ سرائیکی نیشنل پارٹی کا ترجمان تھا اور نہ جانے کب اس نے کوئی ایسی اَن دیکھی لال سیما پار کر لی جو اسے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ واللہ اعلم۔

میں تو احمد مصطفیٰ کانجو سے ذاتی طور پر واقف بھی نہیں ہوں چہ جائیکہ ان کی سیاسی جماعت سے کوئی وابستگی ہوتی۔ ہاں، ہر خطّے کے عوام کے بنیادی حقوق کی پاسداری اور ہر مردوزن کے اظہارِ رائے کی اہمیت کا احترام بنیادی امر ہے۔

ایک سادہ سی بات یہ ہے کہ اگر حکومت کی دانست میں اس آدمی نے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے تو اس پر مقدّمہ چلایا جائے اور دونوں جانب کے دلائل سُن کر عدالت فیصلہ کرے۔ سرائیکی قوم پرست تو یوں بھی کون سے علیحدگی پسند ہیں۔ ان میں زیادہ تر تو محض صوبہ مانگتے ہیں۔ ہمارے کچھ دوست انہیں یہ بھی سمجھاتے نہیں تھکتے کہ اگر صرف صوبہ بن جانے سے قومی، معاشی اور طبقاتی مسائل کا حل ممکن ہوا کرتا تو چار صوبے پہلے سے ہیں۔ مگر چلیے یہ بحثِ دیگر ہے۔ سرائیکی نیشنل پارٹی جمہوریت چاہتی ہے۔ تو بھئی یہ تو دستور کے عین مطابق ہے۔ مقامی وسائل پر مقامی آبادی کا حق مانگتی ہے۔ یہ بھی کوئی انوکھا مطالبہ نہیں۔

میں تو احمد مصطفیٰ کانجو سے ذاتی طور پر واقف بھی نہیں ہوں چہ جائیکہ ان کی سیاسی جماعت سے کوئی وابستگی ہوتی۔ ہاں، ہر خطّے کے عوام کے بنیادی حقوق کی پاسداری اور ہر مردوزن کے اظہارِ رائے کی اہمیت کا احترام بنیادی امر ہے۔ ویسے شاعروں کے سیاسی نظریات کو کوئی کیا سنجیدہ لے گا مگر پھر بھی نظریاتی طور پر میری بائی فوکل عینک کے عدسوں میں طبقاتی سوال کا عدسہ بڑا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ جمہوری، قومی اور طبقاتی حقوق کی بحث کا نہیں، صریح ظلم کا ہے۔

احمد مصطفیٰ کانجو کے نانا میجر (ریٹائرڈ) عبدالنبی کانجو پاکستان بننے کے بعد دوسرے لانگ کورس سے فارغ التحصیل تھے اور 1970ء میں منتخب ہونے والی آئین ساز اسمبلی کے رُکن۔ میجر کانجو کی صاحبزادی شمیم ضعیف ہیں اور اپنے گھر کی جوان بلّی کی طرح مستعد نہیں کہ وقت آنے پر اپنے بلونگڑے کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر سکتیں۔

اب اگر احمد مصطفیٰ کانجو بخیریت واپس آ جائے تو کانجو محلّے کے بچّے اور بلونگڑے پھر سے خوش ہو جائیں گے اور ان کی مائیں سب کو آباد رہنے کی دعائیں دیں گی۔ ارباب اختیار کو حضرت علّی کی یہ بات جتنی جلد سمجھ میں آ جائے اتنا اچھا ہو کہ حکومتیں کفر پر تو قائم رہ سکتی ہیں، ظلم پر نہیں۔

[حارث خلیق انگریزی اور اردو کے شاعر اور ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کے سیکرٹری۔ جنرل ہیں۔]

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں/ کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ/ اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

ہم ''انسان'' کے ساتھ کھڑے ہیں

زاہدہ حنا

آج اپنی ایک تحریر یاد آئی جو میں نے گیارہویں سارک ادبی کانفرنس میں پڑھی تھی۔اس تحریر میں ادب اور امن کے رشتے پر گفتگو کی گئی تھی۔ادب کی روح میں نفرت سے کنارہ کرنا ہے۔اسی لیے ایک دانشور نے کہا تھا'' کہ یہ ادب ہے جس میں انسانیت اپنی سچی تصویر دکھاتی ہے۔

ادب نے ابتدا سے آج تک انسانی سماج کے اندر موجود مختلف نفرتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ذات پات،عقیدہ،نسل،رنگ،طبقاتی اور لسانی تقسیم،فرقہ واریت اور آج اکیسویں صدی کی نئی نفرتوں کی باڑھ کے سامنے انسان دوستی،رواداری اور افہام وتفہیم کا بند ادب نے باندھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس وقت دنیا میں چھ ہزار زبانیں ہیں۔یہ زبانیں جو موجود ہیں،اور وہ زبانیں جو مٹ گئیں،ان کا ادب انسان کو انسان سے،فطرت اور اس کی عنایتوں سے عشق کرنا سکھاتا ہے۔موہنجوڈرو سے برآمد ہونے والی عبارتیں جو پڑھی نہیں گئیں،جب پڑھ لی جائیں گی تو وہ یا کسی گرہستن کے گھر کا حساب ہوں گی،یا کسی محبت بھری نظم کا ٹکڑا ہوگا لیکن یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ کوئی جنگی گیت نہیں ہوگا۔یوں بھی موہنجوڈرو سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا ہے،وہاں کے شاعر جنگی گیت کیسے لکھتے؟

کھدائی میں برآمد ہونے والے مصریوں کے لکھے ہوئے وہ پیپرس جو چار ہزار برس پرانے ہیں،ان میں بھی ہمیں نفرت کا درس نہیں ملتا،عشق کا ترانہ ہے،انصاف کی طلب گاری ہے اور دریائے نیل کی لہروں کے قصے ہیں۔

سوال اگر یہ اٹھے کہ نفرت کے نقوش مٹانے کے لیے ادب کیا کردار ادا کرتا ہے؟تو یہ بات کرنے سے پہلے ہمیں سماجی سائنس کی بنیاد پر یہ تعین کرنا پڑے گا کہ سماج میں ذات پات،عقیدہ،نسل،رنگ،طبقاتی اور لسانی تقسیم اور فرقہ واریت کی بنیاد پر انسانوں نے انسانوں سے جو اجتماعی یا انفرادی نفرت کی ہے،وہ کس حد تک انتہا کو پہنچی ہے،اس انتہا کو جہاں میدان جنگ میں یا جگہوں،بازاروں اور گھروں میں انسان مختلف وجوہ کی بناء پر اپنے جیسے انسانوں کو ہلاک کرتا ہے۔ہم آج بھی ان ہی انتہاؤں کی جھلکیاں دیکھ رہے ہیں۔

اس حوالے سے اگر ہم ہیلی،ویکس،فٹز اور رمزے جیسے موجودہ سماجی سائنس دانوں کی تحقیقات پر نگاہ ڈالیں تو وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ 10 لاکھ سال قبل مسیح سے سنہ 2000ء بعد مسیح تک اکیانوے ارب انسان پیدا ہوئے۔ان میں سے بہ مشکل ایک سے دو فی صد انسان اجتماعی یا انفرادی طور پر اس قدر شدید نفرت میں مبتلا ہوئے کہ انھوں نے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو قتل کیا۔

سماجی سائنس دان اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بنیادی طور پر انسان متشدد اور نفرت پسند نہیں۔اس کی ایک بہت بڑی مثال عالمی ادب ہے جو انسانوں کے دلوں میں نرمی،تحمل،رواداری اور محبتوں کے بیج بوتا ہے۔

گوتم بدھ نے ذات پات کی بھیانک تقسیم کے خلاف آواز بلند کی تو یہ نہیں کہا کہ اس بھیانک غیر انسانی نظام کے خلاف تلوار اٹھالو۔وہ لوگوں کے دلوں میں محبت،تحمل رواداری کے بیج بوتے رہے،کالنگا کے میدان میں لاکھ سپاہیوں کی لاشوں کے درمیان کھڑے ہوئے اشوک کے دل میں یہی بیج پھوٹا تو سارے ہندوستان میں،بلخ اور بامیان میں سپاہیوں کی تلواروں کو زنگ لگتا رہا،ان کے گھروں میں رکھی ہوئی چھریاں،عورتیں سبزی کاٹنے کے لیے تیز کرتی تھیں۔اس دنیا کی ہر زبان،ہر زمانے اور ہر زمین کے ادیب کا ذہن افق تا افق آسمان کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے،تب ہی وہ اپنے دامن میں انھیں بھی سمیٹ لیتا ہے جو نفرت کرتے ہیں۔نفرت کرنے والوں کے دلوں پر پڑے ہوئے زنگ آلود قفل کو مہاتما گاندھی نے اور نیلسن منڈیلا نے اپنے لفظوں سے کھولا۔

تلسی داس،کالی داس،کبیر،میرا بائی،امیر خسرو،میر،غالب،مخدوم،سردار جعفری،کیفی،جوش اور ساحر نے انسانوں کو قریب لانے اور دلوں کو جوڑنے کی بات کی۔ہمارے رتن ناتھ سرشار کا ''فسانہ آزاد'' ہندوستان کی مشترکہ ہندایرانی تہذیب کا ایک عظیم الشان منظر نامہ ہے جس میں ہندو مسلمان،عورت،مرد،سب ہی ایک پھیلی ہوئی اور عظیم تہذیب کا حصہ ہیں۔اسے پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتنی بڑی مشترک تہذیب کے وارث ہیں،یہ جان کر دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کیسی گنجائشیں نکلتی ہیں۔

1936ء کی ترقی پسند تحریک ہو یا برمی زبان کی کھٹسان ادبی تحریک، ہمارے پریم چند اور سجاد ظہیر ہوں یا برما کے منتھو وا،ان لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں انسانی غم واندوہ اور ان کے زمینی مسائل کے بارے میں لکھا۔اسی طرح بنگلہ ادب میں ٹیگور نے مذہب اور ذات پات کی تقسیم سے بلند ہوکر گیتانجلی،گورا اور کابلی والا جیسی تخلیقات دنیا کو دیں۔سرت چندر چٹرجی، رقیہ سخاوت حسین،نذرالاسلام،علاء الدین آزاد،سید شمس الحسن،سید شمس الرحمٰن،سلینا حسین انسان دوست ادیبوں کی ایک بہت بڑی برادری ہے جس نے انسانوں کے دلوں سے نفرتوں کو دھونے کی کوششیں کیں۔

اسی طرح پنجابی،سندھی،کشمیری،تامل،تیلگو ہماری کون سی زبان ہے،جس کے لکھنے والوں نے اپنے قلم سے سوئی کا کام نہیں لیا اور سماج کی ادھڑی ہوئی بُنت کو اور دلوں کو رفو کرنے کی کوشش نہیں کی۔

برصغیر میں جب فرقہ وارانہ بنیاد پر نفرت کی کالی آندھی چلی تو ہمارے کچھ ادیبوں نے مایوسی کے عالم میں یہ اعلان کیا کہ انسان مرگیا ہے۔عین اسی وقت کرشن چندر،منٹو،عصمت،احمد ندیم قاسمی،خوش ونت سنگھ،بھیشم ساہنی،فیض،امرتا پریتم،سردار جعفری،کیفی،مخدوم،تاباں، جوش،کملیشور،جگن ناتھ آزاد،ساحر،اور ان کے بعد آنے والے رتن سنگھ،قرۃالعین حیدر،مہندر ناتھ،جوگندر پال،جیلانی بانو اور ان گنت نامور اور گمنام ادیبوں کی تحریروں میں اس زندہ انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دے رہی تھیں یہ انسان ہمیشہ سے موجود تھا اور ہمیشہ موجود رہے گا وحشت اور بربریت کے زمانوں میں بھی ادب اور ادیب نے اس انسان کو زندہ رکھا ہے۔

ہمارے ان ادیبوں کی تحریریں،فرقہ واریت سے لڑائی لڑتی رہیں اور بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرتی رہیں۔بعد میں آنے والوں نے بھی یہ کام کیا اور آج بھی کررہے ہیں۔مہاشویتا دیوی،جیا مترا،شو مورتی،گلزار،وبھوتی نرائن رائے،اُدے پرکاش نرائن،انوش مالویہ، سروپ دھرو،اسی طرح پاکستان میں شیخ ایاز،اختر جمال،امر جلیل اور ان گنت دوسرے نفرتوں کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔ہندوستان کے ادیبوں کی نئی نسل میں ہم ارون دھتی رائے کو کس طرح بھلا سکتے ہیں، جس نے کہا کہ اگر ہندوستان کے ایٹمی دھماکوں کے خلاف لکھنا اور برصغیر کے کچلے ہوئے پسے ہوئے اور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے حق میں لکھنا غداری ہے تو سن لیا جائے کہ میں غدار ہوں۔اور یہ غداری میں کرتی رہوں گی۔

ادیب کا قلم ہر وضع کی نفرتوں کے خلاف لڑتا ہے۔صنفی بنیادوں پر ایک نفرت عورتوں سے کی گئی اور انھیں غیر انسان سمجھا گیا۔اس نفرت کے خلاف جون اسٹوارٹ مل،مارکس،اینگلز اور جارج برنارڈ شا نے اور اس کے بعد آنے والے بہت سے مردوں اور عورتوں نے ان صنفی تعصّبات کو ختم کرنے اور دونوں صنفوں کے درمیان تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔یہ کام سولہویں صدی سے شروع ہوگیا تھا اور بیسویں صدی میں یہ اپنے عروج کو پہنچا۔ورجینیا وولف سے سیمون دی بووار،ٹونی مورسن اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی خواتین ادیبوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو اپنی تحریروں سے صنفی تعصّبات کے بارے میں لکھ رہی ہے۔

اسی طرح ہمارا دلت ادب ہے جو ذات پات کے تعصّبات کے کانٹے چن رہا ہے۔بلیک ادب ہے جو رنگ اور نسل کے تعصّبات کے خلاف نبرد آزما ہے،یہودی اور عرب ادیب ہیں جو مشرق وسطیٰ کے تنازعات کے بارے میں کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے اس 'انسان' کے ساتھ کھڑے ہیں جو یہودی بھی ہے اور مسلمان بھی۔عراق اور افغانستان پر امریکا کے ظالمانہ اور غاصبانہ حملوں کے خلاف بھی دنیا میں متعدد ادیبوں نے لکھا اور وہ شاعر ہیں جنھوں نے خود کو ''جنگ مخالف شعرا'' کا نام دیا ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران کتنے بہت سے ادیبوں نے فاشزم کے خلاف لکھا اور امریکی سامراج کی بوئی ہوئی نفرتوں کی بارودی سرنگوں کو اپنے قلم کی نوک سے صاف کیا۔برٹرینڈ رسل،ژاں پال سارتر،فرانز فینن سے ایڈورڈ سعید،نجیب محفوظ اور پہلی اور دوسری دنیا کے متعدد ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں نے نفرتوں اور عصبیتوں کی آگ کو بجھانے کا کام کیا۔

دنیا بھر کی زبانوں میں وہ بڑا ادب ہمیں رنگ دکھاتا ہے جس نے انسانی سماج کے اندر موجود مختلف نفرتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ذات پات، عقیدہ،نسل،رنگ،طبقاتی اور لسانی تقسیم اور فرقہ واریت کے زہر کو انسانی سماج سے نچوڑنے کی کوشش کی ہے۔

(ادب ققنس (PHOENIX) کی طرح ہے جو بدترین فرقہ واریت،مذہب،رنگ،نسل یا طبقاتی نفرت کی آگ سے جنم لیتا ہے اور انسان دوستی کا گیت گاتا ہے۔جس طرح فطرت اپنی عنایتیں سب پر کرتی ہے،اسی طرح ادیب ان کے لیے بھی لکھتا ہے جو نفرتیں تقسیم کرتے ہیں، اور ان کے دلوں سے نفرتوں کو دھونے کی کوشش کرتا ہے۔تب ہی ادیب یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہم ''انسان'' کے ساتھ کھڑے ہیں۔

(بشکریہ ایکسپریس اردو)

چونیاں (قصور) میں بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اوران کے قتل کے واقعات پر فیک فائنڈنگ رپورٹ

تعارف

مہذب معاشرے اپنے بچوں کے ساتھ اچھے سلوک اوران کے تحفظ سے پہچانا جاتا ہے۔ ضلع قصور 17 ستمبر کو چار بچوں کی نعشوں کی برآمدگی کی افسوسناک اطلاعات پر ایک بار ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ان چاروں بچوں کے نام یہ ہیں: فیضان، حسنین، عمران اور سلیمان۔ شبہ ہے کہ انہیں جنسی زیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ اس سے قبل قصور میں بچوں کے ریپ اور قتل کے کئی واقعات پیش آئے جنہیں بہت زیادہ عوامی توجہ ملی۔ ایسے ہی واقعات کے دوران 2015 میں پورنوگرافی کا ایک گروپ بھی کا بھی پتہ چلا اور 2018 میں چھ سالہ زینب انصاری کا ریپ اور قتل بھی انہیں واقعات کا حصہ تھا۔ اطلاعات کے مطابق، یہ 10 کلومیٹر کی حد میں ایک برس میں بچوں کے ساتھ زیادتی کا بارہواں واقعہ تھا۔

حالیہ واقعہ کے متعلق ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے بعد، ایچ آر سی پی نے 23 ستمبر کو قصور کے علاقے میں چونیاں میں ایک چار رکنی ٹیم بھیجی۔ ٹیم محترم راجہ اشرف (ایچ آر سی پی کے کونسل رکن)، محترمہ صاحت ریاض (وکیل)، محترم افتخار احمد بٹ (ایچ آر سی پی کے رکن) اور محترم دانیال انور (ایچ آر سی پی کے سٹاف ممبر) شامل تھے۔ ٹیم نے ڈپٹی کمشنر، ڈی ایس پی جو واقعے کی تحقیقات کر رہے ہیں، اور تین مقتول بچوں کے ورثا سے ملاقات کی۔ اگرچہ پولیس نے تو ان اقدامات کی وضاحت کی جو انہوں نے کچھ حد تک کیے تھے مگر متاثر بچوں کے ورثاء کا کہنا تھا کہ انہیں انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بہت کم یا کسی قسم کی مدد نہیں ملی اور انہیں کوئی امید نہیں کہ پولیس کی تحقیقات کے نتیجے میں مجرم کا مجرموں کا سراغ مل جائے گا۔

مفصل حقائق

ڈپٹی کمشنر قصور اظہر حیات نے مجرموں کی گرفتاری کے لیے سول انتظامیہ اور پولیس کی کوششوں کے بارے میں آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات کے بارے میں آگاہی پھیلانے اور ایسے واقعات کی روک تھام کے لیے مقامی سطح پر گروپ بنائے گئے ہیں۔ چائلڈ پروٹیکشن بیورو کو مضبوط کیا جائے گا۔ محکمے کی پہنچ بڑھانے کے لیے حکومت نے نے اگلے 15 دنوں میں گاؤں/ یونین کونسل کی سطح پر کمیٹیاں بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کمیٹیاں مقامی سرکاری اسکول کے ہیڈ ماسٹر، امام مسجد، نمبردار اور گاؤں کے کسی اور نمایاں شخص پر مشتمل ہوں گی۔ تاہم، وہ یہ نہ بتا سکے کے ایسا اب تک کیوں نہیں ہو سکا خاص طور پر زینب انصاری کے واقعے کے بعد۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اس عمل میں غیر سرکاری تنظیموں کو شامل کریں گے تو محترم حیات نے کہا کہ اگر انہیں اس حوالے سے کوئی خاص درخواست موصول ہوئی تو وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں گے۔ ٹیم نے محسوس کیا کہ وہ این جی اوز کو اس عمل میں شامل کرنے سے گریزاں تھے۔ مقدمات کے تفتیشی افسر ڈی ایس پی درانی نے ٹیم کو واقعے کی تفصیلات اور پولیس کی کوششوں کے متعلق بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ ڈی پی او کا دفتر عارضی طور پر قصور سے چونیاں منتقل ہو گیا ہے۔ مگر وہ ٹیم سے ملاقات کے لیے دستیاب نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ تلاشی کا دائرہ بڑھانے سے پہلے پولیس تمام متاثرین کے گھروں کے تین کلومیٹر کی حد میں رہنے والے لوگوں کے ڈی این اے کے نمونے اکٹھے کر رہی ہے۔ ان کا دعوی تھا کہ پولیس لگ بھگ 80 فیصد تک ملزموں کے قریب پہنچ چکی ہے اور مقدمے کو نبٹانے کے مرحلے میں ہے۔ تاہم انہوں نے بچوں کے ساتھ زیادتی کی وجہ غربت اور والدین کی طرف سے بچوں کی دیکھ بھال نہ ہونے کو قرار دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ زینب انصاری ریپ اور قتل

وقوعے میں اکٹھے ہونے والے ڈی این اے کے نمونے پولیس کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اب تک لوگ ڈی این اے کے نمونے دینے کے لیے تعاون کر رہے ہیں۔

ٹیم نے آٹھ سالہ مقتول بچے فیضان کے والد رمضان سے ملاقات کی۔ رمضان مقامی مسجد کے امام ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا بچہ تیسری جماعت کا طالبعلم تھا اور وہ 16 ستمبر کو اغواء ہوا تھا۔ اس سے اگلے دن ایک گڑھے سے فیضان کی نعش ملی۔ رمضان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بہت مشکل سے بول رہے تھے اور ٹیم کے صرف چند سوالات کے جواب ہی دے سکے۔ ان کا کہنا تھا کا ان کے خاندان کی کسی کے

ٹیم نے آٹھ سالہ مقتول بچے فیضان کے والد رمضان سے ملاقات کی۔ رمضان مقامی مسجد کے امام ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کا بچہ تیسری جماعت کا طالبعلم تھا اور وہ 16 ستمبر کو اغواء ہوا تھا۔ اس سے اگلے دن ایک گڑھے سے فیضان کی نعش ملی۔ رمضان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ بہت مشکل سے بول رہے تھے اور ٹیم کے صرف چند سوالات کے جواب ہی دے سکے۔ ان کا کہنا تھا کا ان کے خاندان کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔

ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب انہوں نے پہلی دفعہ شکایت درج کروائی تو سول انتظامیہ خاص طور پر پولیس کا رعمل بہت مایوس کن تھا۔بچوں کی گمشدگی کے واقعے میں پولیس اورسول انتظامیہ کے عدم تعاون کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے 16 ستمبر کی صبح کو مقامی لوگ اکٹھا ہوئے۔ رمضان کا بیٹااسی شام غائب ہوا تھا۔ ایک ہمسائے جس سے ٹیم نے بات کی ، کا دعوی تھا کہ پچھلے چار برسوں میں بچوں کے ساتھ زیادتی کے لگ بھگ 700 واقعات پیش آئے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ انتظامیہ کے خیال میں مجرم صرف ایک ہی آدمی ہے۔

دوسرا متاثرہ بچہ سلمان آٹھ برس کا تھا اوردوسری جماعت میں زیرتعلیم تھا۔ اس کا خاندان ناہموارزمین پرتعمیرشدہ تین کمروں کی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے۔سلمان کے خاندان نے ایچ آرسی پی کی ٹیم کو بتایا کہ وہ آٹھ اگست سے لاپتہ تھا۔ اس کے والدین نے ایف آئی آردرج کروانے کے لیے پولیس اسٹیشن کے کئی چکرلگائے۔ تاہم جب بھی وہ گئے انہیں کہا گیا کہ وہ خود اپنے بچے کی تلاش کریں۔ مثال کے طور پر، انہیں کہا گیا کہ وہ کسی رشتہ دار کے گھر میں یا کسی ہمسائے کے گھر میں یا قریبی دربار پر جا کراس کا پتہ کریں۔ بچے کے ورثاء نے بتایا کہ پولیس نے ایف آئی آرصرف اس وقت درج کی جب بچوں کی گمشدگی کی خبرعام ہوئی اورمقامی لوگوں نے انصاف کے لیے احتجاج کیا۔سلمان کی والدہ نے بتایا کہ پھر پولیس نے اس کے کپڑے برآمد کیے مگر22 اگست تک اس کی موت کی تصدیق نہیں کی تھی۔

آخر میں ٹیم نے حسنین کے والدین سے ملاقات کی جو سلمان کے خاندان سے دوگلیاں آگے رہائش پذ ?رہیں۔ علی کی والدہ نے بتایا کہ اس کا نو سالہ بچہ ہوزری بیچنے میں اپنے والد کی مدد کرتا تھا۔ وہ 17 اگست 2019 کو لاپتہ ہوا۔اس کے خاندان اس کی گمشدگی کی اطلاع دینے کے لیے 18 اگست کو پولیس اسٹیشن گئے:انہوں نے پولیس کو اپنے بچے کی ایک تصویردی اورایک درخواست فارم پرکیا۔حسنین کے وقوعے کی طرح پولیس نے انہیں کہا کہ داتا دربار یا کسی ہمسائے یارشتہ دار کے گھر جا حسنین کی تلاش کریں۔علی کے والد نے ٹیم کوان کی درخواست کی جمع بندی کی ایک پھٹی ہوئی رسید ٹیم کو دکھائی۔ان کا کہنا تھا کہ ان کے پاس ایف آئی آرکی باضابطہ نقل نہیں ہے کیونکہ پولیس نے انہیں وہ نقل نہیں دی تھی۔

تمام تین نعشیں قصبے کے قریب ایک ریتلی ویران جگہ پرایک ساتھ ہی پائی گئی تھیں۔ فیضان کی نعش کو ریت بیچنے والے ایک فرد کی اطلاع پرمقامی لوگوں نے ڈھانپا تھا۔ باقی نعشیں پولیس کو ملی تھیں۔ اطلاع دینے والوں نے بتایا کہ پولیس نے تینوں متاثرین کی باقیات کوڈی این اے کے لیے بھیجا تھا۔ 27 ستمبر کو ذرائع ابلاغ نے اطلاعات دیں کہ پولیس نے 21 مشتبہ افراد کو گرفتار کیا ہے اور پولیس کے پاس ابھی تک کوئی حتم شواہد نہیں جس کے بنا پر وہ کسی پر الزام عائد کرنے کا فیصلہ کرے۔

سفارشات

ایف آئی آر کے اندراج کا عمل شکایت کنندگان کے لیے آسان بنایا جائے اور پولیس کو لاپتہ بچوں کے واقعات کے حوالے سے حساس بنایا جائے۔

قصبے میں سیکیورٹی کیمرے نصب کیے جائیں۔

اسکول، کالجز، مدرسے اورمساجد کو بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات پرآگہی پھیلانے اوربچوں کے تحفظ کے لیے تجاویز دینے والے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جائے

جن علاقوں میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں، ان کی جامع تلاشی لی جائے تاکہ کسی اورقسم کی شہادت مل سکے اورانتظامیہ ایسے علاقوں کی نشاندہی کرے تاکہ اس وقت ایسے علاقوں میں جانے سے گریز کریں۔

بااثرشخصیت کے رشتہ داروں کی فائرنگ، ایک شخص جاں بحق

نوشہرہ نوشہرہ کے علاقہ ڈھیری کٹی خیل میں ظلم وبربریت کی انتہاء کردی گئی۔ بااثر سرکاری شخصیت کے رشتہ داروں نے نوشہرہ میں دھاوابول کرغریب شہری کوگھر کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا جبکہ دوسرا شخص زخمی ہوگیا۔نوشہرہ کینٹ پولیس بااثرشخصیت کے رشتہ داروں کو تھانے میں بٹھا کر خاطر مدارت کرتی رہی جبکہ متاثرہ خاندان اہل علاقہ کے ہمراہ تھانے کے باہر ایف آئی آر درج کرنے کیلئے منت سماجت کرتا رہا، اہلیان وعمائدین علاقہ کا سڑکوں پر نکلنے کے بعد سرکاری شخصیت سمیت دوملزمان گرفتار کرلئے گئے۔لیاقت، شیراز، عاطف جوکہ ایک اعلی سرکاری افسر کے قریبی رشتہ دار ہیں کا ڈھیری کٹی خیل حکیم آباد ضلع نوشہرہ کے رہائشی شاہ نواز نامی شخص کے ساتھ معمولی تکرار ہوئی تھی اوراس میں راضی نامی بھی ہوا تھا لیکن لیاقت، شیراز اوران کے دیگر ساتھیوں جن کے نام عاطف اورسہیل بتائے جاتے ہیں نے 21 ستمبر کی صبح ڈھیری کٹی خیل میں شاہ نواز کے رشتہ دار عظمت ولد مرتضی خان کے گھر پر دھاوابول کراس کے گھر پر فائرنگ شروع کردی۔فائرنگ کے نتیجے میں عظمت ولد مرتضی خان موقع پر جاں بحق ہوگیا۔جبکہ ظفرعلی ولد ثمرخان زخمی ہوا،عمائدین علاقہ سابق بلدیاتی نمائندگان اوراہلیان علاقہ واقعے پرسراپا احتجاج بن گئے اورواقعے کی مذمت اورنوشہرہ کینٹ پولیس کے رویئے کے خلاف سڑکوں پر نکلے،عینی شاہدین کے مطابق ڈھیری کٹی خیل پرحملہ کیا گیا ہے۔نوشہرہ کینٹ پولیس نے واقعے کا مقدمہ بھی درج کردیا۔

(روزنامہ آج)

لیڈی ہیلتھ ورکر کوقتل کردیا گیا

پشاور 5 ستمبر 2019ءکوتھانہ پشتہ خرہ کے علاقے رنگ روڈ پر مسلح موٹر سائیکل سواروں نے فائرنگ کرکے نجی فاؤنڈیشن کی لیڈی ہیلتھ ورکر کوقتل کردیا۔ملزمان واردات کے بعد موقع سے فرار ہوگئے، پولیس نے مقدمہ درج کرکے مزید تفتیش شروع کردی ہے۔ پولیس کے مطابق عابدحسین ولد اختر حسین سکنہ پشتہ خرہ نے رپورٹ درج کراتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ اس کی اہلیہ مسماۃ شازیہ بی بی جوفاطمید فاؤنڈیشن میں بطور ورکر کام کرتی تھی، جمعرات کی صبح ڈیوٹی کیلئے جارہی تھی کہ راستہ میں رنگ روڈ پر نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں وہ لگ کر موقع پر دم توڑ گئی جبکہ ملزمان واردات کے بعد موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے، پولیس نے مقدمہ درج کرکے مزید تفتیش شروع کردی ہے۔ (روزنامہ آج)

دس سالہ بچی سے زیادتی

سوات 20 ستمبر 2019ء کو سوات کے علاقہ فتح پور میں دس سالہ بچی کے ساتھ دو افراد نے جنسی زیادتی کی۔ پولیس نے ملزمان کو گرفتار کرلیا ہے۔ پولیس کے مطابق تحصیل خوازہ خیلہ کے علاقہ فتح پور میں دس سالہ جوریہ دختر محمد یوسف کے ساتھ 17 سالہ آفتاب اور 18 سالہ حمزہ نے زیادتی کی۔ پولیس نے متاثرہ بچی کے والد کی مدعیت میں رپورٹ درج کر کے ملزمان کو گرفتار کرلیا، متاثرہ بچی کو میڈیکل کیلئے خوازہ خیلہ ہسپتال منتقل کردیا گیا۔

(روزنامہ ایکسپریس)

خواجہ سراء کا پولیس کے خلاف مظاہرہ

کوہاٹ 22 ستمبر کو کوہاٹ میں خواجہ سراء پولیس کی مبینہ زیادتیوں کیخلاف سڑکوں پر نکل آئے۔ درجنوں خواجہ سراؤں نے مرکزی بازار سے پشاور چوک تک احتجاجی ریلی نکالی۔ مظاہرین نے کہا کہ پولیس ہمیں پروگرامز کیلئے نہیں چھوڑتی ہم جہاں پروگرام کرنے جاتے ہیں پولیس آکر ہمارا پروگرام بند کر کے تشدد کرتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم ناچ گانے کے ذریعے انا پیٹ پالتے ہیں۔

(روزنامہ آج)

لیڈی ہیلتھ ورکرز کی تنخواہیں 6 ماہ سے بند

پشاور صوبائی دارالحکومت کی 2 ہزار سے زائد لیڈی ہیلتھ ورکرز گزشتہ 6 ماہ سے تنخواہوں سے محروم ہیں۔ ایل ایچ ڈبلیو کا کہنا ہے کہ تنخواہوں کے حصول کیلئے وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہیں لیکن ان کی کوئی سننے والا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے فرائض ایمانداری سے 24 گھنٹے ادا کرتی ہیں، گھر گھر جا کر بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگاتی ہیں خواتین کو ابتدائی طبی امداد فراہم کرتی ہیں جبکہ پولیو کے بارے میں والدین میں شعور بھی اجاگر کرتی ہیں، انہوں نے الزام عائد کیا کہ ان کی تنخواہیں پراجیکٹ سے جاری ہوجاتی ہیں لیکن افسران بالا ان تنخواہوں کو اپنے بینک اکاؤنٹس میں رکھ کر منافع کماتے ہیں، انہوں نے دھمکی دی کہ اگر فوری طور پر ان کی تنخواہیں جاری نہ کی گئیں تو وہ احتجاج پر مجبور ہونگی۔

(روزنامہ آج)

قصور: 3 بچوں کے 'ریپ اور قتل' کے خلاف علاقہ مکینوں کا پرتشدد مظاہرہ

قصور صوبہ پنجاب کے ضلع قصور میں 3 بچوں کے اغوا، ان کے مبینہ ریپ اور قتل کے بعد پرتشدد مظاہروں کا آغاز ہوگیا جہاں مظاہرین نے پولیس کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے ذمہ داروں کی گرفتاری کا مطالبہ کردیا۔ پنجاب کے ضلع قصور کی تحصیل چونیاں میں مشتعل مظاہرین نے ٹائر جلا کر سڑکیں بلاک کردیں جبکہ پولیس کے خلاف شدید نعرے بازی کی۔ مظاہرین نے علاقے کے ایک بچے فیضان کے اغوا اور پھر اسے مبینہ طور پر قتل کرنے والے ملزمان کی عدم گرفتاری پر پولیس اسٹیشن کا بھی محاصرہ کیا۔ خیال رہے کہ ضلع قصور کے 4 بچے رواں برس جون سے لاپتہ تھے جن کی عمریں 8 سے 12 سال تک تھیں جن میں گزشتہ روز مردہ حالت میں پایا جانے والا بچہ فیضان بھی شامل ہے جو 16 ستمبر کو لاپتہ ہوا تھا۔ فیضان سے قبل رانا ٹاؤن کا 12 سالہ بچہ محمد عمران 3 جون کو لاپتہ ہوا، غوثیہ آباد کے 9 سالہ علی حسنین اور 8 سالہ سلیمان اکرم بالترتیب 8 اور 17 اگست کو لاپتہ ہوئے جن 2 کی باقیات ایک روز قبل برآمد ہوئیں۔ اس حوالے سے مقامی افراد کا کہنا تھا کہ اسی سلسلے میں پانچواں بچہ بھی لاپتہ ہے۔ پولیس کو ملنے والی لاشوں میں ایک بچے کی شناخت فیضان کے نام سے ہوئی جبکہ دیگر بچوں کی باقیات سے متعلق امکان ظاہر کیا جارہا ہے کہ یہ علی حسنین اور سلیمان اکرم کی ہیں۔ پولیس اب تک محمد عمران نامی بچے کی تلاش میں ناکام رہی ہے لیکن امکان ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس بچے کو بھی مبینہ طور پر قتل کردیا گیا ہے۔ آج فیضان نامی بچے کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں رشتہ داروں سمیت اہل علاقہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ فیضان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تحصیل ہیڈکوارٹر ہسپتال چونیاں کے میڈیکل افسر ذوہیب عابد نے اپنے رائے دیتے ہوئے کہا کہ بچے کی موت گلا دبانے کی وجہ سے ہوئی کیونکہ اس کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی جبکہ اس کے گلے پر نشانات بھی موجود تھے۔ میڈیکل افسر نے اپنی رپورٹ میں تصدیق کی کہ بچے کو موت سے قبل جنسی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ پنجاب فارینسک سائنس ایجنسی (پی ایف ایس اے) سے رپورٹ موصول ہونے کے بعد ہی اس معاملے پر حتمی رائے دی جائے گی۔ دریں اثنا انسپکٹر جنرل (آئی جی) پنجاب پولیس عارف نواز خان کا کہنا تھا کہ چونیاں میں 3 تحقیقاتی ٹیمیں کام کررہی ہیں اور متعلقہ واقعے سے متعلق مختلف لوگوں کے خلاف تفتیش جاری ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ پی ایف ایس اے 3 بچوں کی باقیات کا ڈی این اے ٹیسٹ کرے گا جو مشتبہ ملزم کے ڈی این اے سے میچ ہوجائے گا۔ آئی جی پنجاب نے کہا کہ وہ اس معاملے کی لحہ بہ لحہ معلومات حاصل کررہے ہیں۔ خیال رہے کہ قصور میں اس وقت خوف و ہراس پھیل گیا جب پولیس نے 17 ستمبر کو بچوں کی لاشیں برآمد کیں، اس حوالے سے مقامی افراد کو خدشہ ہے ان بچوں کے قتل میں کوئی گروہ ملوث ہے۔ ڈسٹرکٹ پولیس افسر (ڈی پی او) عبدالغفار قیصرانی نے کہا تھا کہ مارے جانے والے بچوں کے ساتھ جنسی تشدد کی تصدیق میڈیکل رپورٹ کے بعد ہی کی جائے گی۔ انہوں نے اس معاملے میں کسی گروہ کے ملوث ہونے کے تاثر کو رد کردیا اور کہا کہ بچوں کے قتل سے قبل ان کے ریپ ہونے کا امکان موجود ہے۔ وزیراعلیٰ پنجاب عثمان بزدار نے واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے آئی جی پنجاب سے واقعے کی رپورٹ طلب کرلی تھی اور انہوں نے ملزمان کو فوری طور پر گرفتاری کا بھی مطالبہ کیا تھا۔ خیال رہے کہ 16 ستمبر کو قصور کے علاقے چونیاں میں لوگوں نے احتجاج کیا اور کئی دنوں سے لاپتہ رہنے والے بچوں کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ تاہم انتظامیہ کی جانب سے انہیں یقین دہانی کروائی گئی کہ وہ معاملہ جلد حل کریں گے جس کے بعد مظاہرہ ختم ہوگیا تھا۔ واضح رہے کہ پنجاب کے ضلع قصور گزشتہ چند سالوں کے دوران بچوں کے اغوا اور پھر ان کے ساتھ ریپ کے واقعات ہوئے جن میں جنوری 2018 میں 6 سالہ زینب کے ریپ اور قتل کا واقعہ بھی شامل ہے جس کی وجہ سے پورے ملک میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی اور ملک گیر مظاہرے بھی دیکھنے میں آئے تھے۔ عمران علی نامی شخص زینب کے ریپ اور اس کے قتل میں ملوث پایا گیا جسے ٹرائل کے بعد پھانسی دے دی گئی تھی۔ اسی طرح قصور کا علاقہ حسین خان والا 2015 میں اس وقت دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا جب وہاں پر بچوں کی فحاش ویڈیو بنانے والا ایک گروہ بے نقاب ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں ویڈیوز منظر عام پر آئیں تھیں جن میں ایک گروہ درجنوں بچوں اور بچوں کو جنسی عمل کرنے پر مجبور کررہے ہیں۔ اسی طرح یہ گروہ بچوں کی فحش ویڈیو بنا کر متاثرہ خاندان کو بلیک میل کر کے ان سے کروڑوں روپے اور سونا لوٹنے میں بھی ملوث رہا۔

مظاہرین نے روڈ پر ٹائر جلا کر سڑک بلاک کردی

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

13 سالہ بچی لاپتہ، اہلخانہ کا پولیس کی 'کاہلی' کے خلاف احتجاج

اسلام آباد اسلام آباد میں لاپتہ ہونے والی 13 سالہ بچی کے اہلخانہ نے اس کی تلاش کے لیے گھر گھر رابطوں کا آغاز کردیا۔ پیر کے روز رامنا سیکٹر کی مساجد سے یہ اعلانات کیے گئے تھے کہ 13 سالہ بچی سیکٹر جی-8/1 میں اپنے گھر کی جانب پیدل جاتے ہوئے لاپتہ ہوگئی ہے۔ مقامی رہائشیوں نے گمشدگی کا معلوم ہوتے ہی اہلخانہ کی مدد کے لیے اس کی تصاویر اور تفصیلات سوشل میڈیا پر جاری کی تھیں۔ لڑکی کے بھائی اور چچا نے ڈان سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ وہ گزشتہ رات ساڑھے 7 بجے سڑک پر چہل قدمی کے لیے نکلی تھی لیکن اس کے بعد وہ واپس نہیں آئی۔ بھائی کا کہنا تھا کہ دیگر گھروں پر لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی فوٹیج کا معائنہ کیا گیا تاہم اس میں کچھ نہیں ملا جبکہ اسٹریٹ لائٹس دو روز سے کام نہیں کررہی تھیں اور انہیں آج ٹھیک نہیں کیا گیا۔ بچی کے چچا کا کہنا

تھا کہ وہ اپنے والد کا موبائل فون استعمال کرتی تھی اور اس کا فیس بک اکاؤنٹ بھی استعمال کرتی تھی، گزشتہ رات اہلخانہ کو معلوم ہوا کہ کسی اور جگہ سے اس کا فیس بک اکاؤنٹ لاگ ان کیا گیا ہے اور اس کے تمام میسجز ہٹادیے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچی کا فیس بک اکاؤنٹ بھی ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی تاہم وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس نے چند افراد کو گرفتار کیا ہے کہ جس میں بچی کے اسکول کے چند ساتھی طالب علم بھی شامل ہیں۔ بچی کے بھائی کا کہنا تھا کہ ان کے اہلخانہ نے پولیس سے رابطہ قائم کیا اور 'کراچی کمپنی تھانے' میں درخواست دائر کی جس کے بعد رات 10 بجے نامعلوم افراد کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'رات ایک بجے پولیس حکام نے گھر کا دورہ کیا، معلومات اکٹھا کیں اور کہا کہ وہ صبح 9 بجے کیس پر کام کا آغاز کریں گے'۔ انہوں نے مزید کہا کہ 'پولیس نے یقین دہانی کرائی کہ وہ 9 بجے دوبارہ آئیں گے لیکن وہ ایک بجے تک نہیں آئے'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'پولیس نے 3 مرتبہ گھر کا دورہ کیا لیکن نیشنل پریس کلب کے باہر احتجاج کرنے تک تحقیقات کا آغاز نہیں کیا تھا، ہم نے پولیس کے نامناسب رویے کو دیکھتے ہوئے احتجاج کرنے کا ارادہ کیا تھا'۔ بچی کے بھائی اور چچا کا کہنا تھا کہ وہ بچی کے تحفظ اور فوری بازیابی کے لیے حکومت کی توجہ اس کیس کی جانب دلوانا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ 'احتجاج شروع ہوتے ہی پولیس کے سینئر افسر پریس کلب پہنچے اور ہم سے احتجاج کی کال واپس لینے کا کہا'۔ انہوں نے کہا کہ 'ہم نے بچی کو بازیاب کرانے کے لیے کارروائی کا آغاز کرنے میں پولیس کی روایتی سستی دیکھی ہے، یہ معاملہ سنگین ہے مگر پولیس کو کارروائی کے لیے 18 گھنٹے لگے ہیں'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'ہمیں یہ بتایا تو گیا کہ ہمیں احتجاج کا حق ہے مگر احتجاج کی کال واپس لینے پر زور ڈالا گیا اور کہا گیا کہ ہمارا ساتھ دیں تاکہ ہم تحقیقات کا آغاز کرسکیں اور پھر ہمیں کراچی کمپنی تھانے لے جایا گیا'۔ معاملے پر انسپکٹر جنرل آف پولیس محمد ذوالفقار خان اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس (آپریشنز) وقارالدین سید کا موقف لینے کے لیے رابطہ قائم نہیں ہوسکا۔ (انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

خاتون اور بچہ جاں بحق

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ ڈی ایچ کیو ہسپتال میں افسوس ناک واقعہ پیش آیا ہے جہاں پیر محل سے زچگی کے لیے لائی جانے والی خاتون زرنیہ بی بی ڈاکٹرز کی مبینہ غفلت کے باعث بچے سمیت جاں بحق ہوگئی لواحقین نے الزام عائد کیا ہے کہ زرینہ بی بی کو چار بجے ڈلیوری کے لیے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال لایا گیا جہاں چار گھنٹے بعد ڈاکٹر نے خاتون کو ایمبولنس میں ڈال کر ہسپتال کے باہر بھجوادی۔ لواحقین کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر کی مبینہ غفلت اور عملے کی بدتمیزی کے باعث خاتون اور بچے کی موت واقع ہوئی لواحقین نے لاشیں سول ہسپتال میں رکھ کر ڈاکٹر اور ہسپتال انتظامیہ کے خلاف احتجاج کیا۔ دوسری جانب خاتون اور بچے کی موت کے بعد ڈاکٹر نے موقف دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ انہیں میڈیا سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ وقعہ 18 ستمبر کو پیش آیا۔ (اعجاز اقبال)

بچوں کے اغوا کا خدشہ

ٹوبہ ٹیک سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہ بلاک پیر محل کے رہائشی جیولرز شاپ کے گھر کے باہر سے چار سالہ عروشہ اور تین سالہ عبدالحنان لاپتہ ہوگئے ہیں شہریوں اور قانون نافذ کرنیوالے والے اداروں کی جانب سے بچوں کو تلاش کیا جارہا تاہم ابھی تک بچوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ تھانہ صدر پولیس نے بچوں کے لاپتہ ہونے کا مقدمہ درج کر کے تفتیش کا آغاز کردیا ہے۔ پورے محلّہ میں سرچ آپریشن بھی کیا گیا جبکہ ڈی پی او اور ڈپٹی کمشنر اپنی ٹیم کے ہمراہ متاثرہ خاندان کے گھر پہنچے اور پوری ضلعی انتظامیہ کے متعلقہ اہلکاروں کو بچوں کی بازیابی یقینی بنانے کے حکم جاری کیا ہے۔ کمسن بچوں کے لاپتہ ہونے پر شہریوں میں خوف وہراس پایا جاتا ہے۔ انہیں خدشہ ہے کہ بچوں کو اغوا کیا گیا ہے۔

(اعجاز اقبال)

لیڈی ہیلتھ ورکر کو قتل کردیا گیا

پشاور 5 ستمبر 2019ء کو تھانہ پشتہ خرہ کے علاقے رنگ روڈ پر مسلح موٹر سائیکل سواروں نے فائرنگ کرکے نجی فاؤنڈیشن کی لیڈی ہیلتھ ورکر کو قتل کردیا۔ ملزمان واردات کے بعد موقع سے فرار ہوگئے، پولیس نے مقدمہ درج کرکے مزید تفتیش شروع کردی ہے۔ پولیس کے مطابق عابد حسین ولد اختر حسین سکنہ پشتہ خرہ نے رپورٹ درج کراتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ اس کی اہلیہ مسماۃ شازیہ بی بی جو فاطمید فاؤنڈیشن میں بطور ورکر کام کرتی تھی۔ ڈیوٹی کیلئے جارہی تھی کہ راستہ میں رنگ روڈ پر نامعلوم موٹر سائیکل سواروں نے فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں وہ لگ کر موقع پر دم توڑ گئی جبکہ ملزمان واردات کے بعد موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے، پولیس نے مقدمہ درج کرکے مزید تفتیش شروع کردی ہے۔

(روزنامہ آج)

کم عمر بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور ویڈیو بنانے کا انکشاف

فیصل آباد تھانہ ترکھانی کے علاقے میں کم عمر بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی اور اس کی ویڈیو بنانے کا انکشاف ہوا ہے۔ پولیس رپورٹ کے مطابق چک نمبر 222 گ ب میں ملزم محسن نے اسی گاؤں کے رہائشی دس سالہ عمیر کو ورغلا کر اپنے گھر لے گیا جہاں محسن اور اس کے ساتھی احد نے اسے باری باری زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ملزم زیادتی کے دوران موبائل فون پر عمیر کی ویڈیو بھی بناتے رہے۔ ملزم دو سال سے اسے بلیک میل کر کے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنا رہے تھے، متاثرہ بچے نے انکشاف کیا کہ ملزم اس کے علاوہ گاؤں کے 20 سے زائد بچوں سے بھی زیادتی کر کے ان کی بھی ویڈیوز بنا چکے ہیں جبکہ اسی گاؤں کے رہائشی لیاقت علی نے پولیس کو دی جانے والی درخواست میں موقف اپنایا کہ اس کا 15 سالہ بیٹا علی رضا نذر عباس کی دکان سے سودا سلف خریدنے کیلئے گیا جسے مذکورہ ملزم بہلا پھسلا کر بیٹھک میں لے گئے اور اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی اور موبائل پر ویڈیو بنائی تھانہ ترکھانی پولیس نے متاثرہ بچے عمیر کے چچا افتخار احمد کی مدعیت میں ملزموں کے خلاف مقدمہ درج کر کے ایک ملزم کو گرفتار کرلیا، ایس ایس پی آپریشنز سید علی رضا بخاری کا کہنا ہے کہ دیگر ملزموں کو بھی جلد گرفتار کرلیا جائیگا

(اعجاز اقبال)

نامعلوم افراد کے ہاتھوں لڑکی اپنے دوست سمیت قتل

پشاور 11 ستمبر 2019ء کو پشاور میں ضم ہونے والے سابق ایف آر پشاور کے علاقے حسن خیل میں غیرت کے نام پر جوانسال لڑکی اور ایک لڑکے کو بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد نعشیں ورثاء کے حوالے کر دیں۔ ایس ایچ او حسن خیل نصیب جان کے مطابق گزشتہ روز نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے مسماۃ حناء دختر غلام حسین ساکن حسن خیل اور رضوان ولد گلستان ساکن ڈیرہ اسماعیل خان کو فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ ابتدائی طور پر معلوم ہوا کہ دونوں کے مابین تعلقات استوار تھے، انہوں نے بتایا کہ جائے وقوعہ سے شواہد اکٹھے کر کے مختلف زاویوں سے تفتیش کا آغاز کر دیا گیا ہے اور بہت جلد ملزمان کو قانون کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا۔ (روزنامہ آج)

تیزاب گردی اور قتل کے مجرم کو 40 سال قید

لاہور لاہور کی انسداد دہشت گردی عدالت نے مقدمے میں نامزد عبدالشکور کو مجرم ثابت ہونے پر مجموعی طور پر 40 سال قید اور 10 لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنادی۔ انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالت نمبر 3 کے جج جاوید اقبال وڑائچ نے کیس کا فیصلہ سنایا۔ عبدالشکور کے خلاف تھانہ فیکٹری ایریا شیخوپورہ میں دہشت گردی کی خصوصی دفعہ 7 اے ٹی اے، تیزاب گردی اور قتل کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ عدالت نے حتمی دلائل سننے کے بعد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو سزا سنائی۔ عدالت نے تیزاب گردی کی دفعہ 336'بی' کے تحت 15 سال قید اور 10 لاکھ روپے جرمانہ، جبکہ قتل کی دفعہ 302 کے تحت مجرم کو 25 سال قید کی سزا کا حکم جاری کیا۔ واضح رہے کہ مجرم عبدالشکور نے 2018 میں اپنی بھابھی پر تیزاب پھینکا تھا اور ملزم کی ماں جب اپنی بہو کو بچانے کے لیے آئی تو وہ بھی تیزاب کی زد میں آ گئی۔ بعدازاں عبدالشکور کی بھابھی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گئی تھی۔ پولیس نے ملزم کے خلاف تیزاب گردی، قتل اور دہشت گردی کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کر کے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ (انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

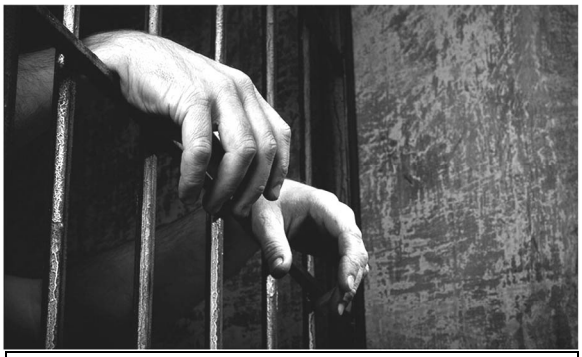

عدالت نے حتمی دلائل سننے کے بعد جرم ثابت ہونے پر ملزم کو سزا سنائی

اسکول پرنسپل پر توہین رسالت کا الزام، شہریوں کا احتجاج

گھوٹکی سندھ کے ضلع گھوٹکی میں مبینہ طور پر توہین مذہب کے واقعے کے بعد حالات کشیدہ ہو گئے جہاں شہریوں کی بڑی تعداد کی جانب سے احتجاج کیا گیا اور مقدمہ بھی درج کرا دیا گیا۔ پولیس نے سندھ پبلک اسکول کے ایک طالب علم کے والد کی شکایت پر اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے اسکول پرنسپل کے خلاف فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (ایف آئی آر) درج کرادی۔ اسکول پرنسپل کے خلاف ایف آئی آر توہین رسالت سے متعلق آرٹیکل 295 سی کے تحت درج کرادی گئی ہے، مقدمے کے اندراج کے بعد علاقے میں احتجاج کیا گیا اور حالات خراب ہو گئے۔ پولیس سے مقامی افراد نے مطالبہ کیا کہ وہ اسکول پرنسپل کو گرفتار کریں جبکہ علاقے میں شٹر ڈاؤن ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا اور مظاہرے بھی کیے گئے جس کی ویڈیو سوشل میڈیا میں بھی جاری کر دی گئی جہاں دیکھا جا سکتا ہے کہ مظاہرین ایک مندر پر چڑھائی کی کوشش کر رہے ہیں اور اسکول کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ گھوٹکی کے سنیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس (ایس ایس پی) فرخ لنجر نے مقامی صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پولیس علاقے میں امن وامان کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈان سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ سندھ کے معاون خصوصی برائے انسانی حقوق ایڈووکیٹ ویرجی کولہی کا کہنا تھا کہ 'مزید کسی نقصان یا کشیدگی سے بچنے کے لیے معاملے کو سنجیدگی سے نمٹایا جا رہا ہے'۔ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے واقعے کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے سوشل میڈیا میں مظاہرین کی ایک ویڈیو جاری کی۔ سماجی رابطے کی ویب سائٹ ٹویٹر میں ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے کہا کہ ' گھوٹکی میں توہین رسالت کے الزامات اور شہریوں کے احتجاج کی خطرناک رپورٹس موصول ہو رہی ہیں'۔ سوشل میڈیا میں گھوٹکی سے ویڈیو جاری کرنے والے افراد نے پاکستان پیپلز پارٹی (پی پی پی) کی مقامی انتظامیہ اور ایڈیشنل آئی جی جمیل احمد سے صورت حال کو کنٹرول کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایڈیشنل آئی جی جمیل احمد نے ایک ٹویٹ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ 'ہم سنجیدہ صورت حال سے تحمل، غیر جانب داری اور پیشہ وارانہ انداز سے نمٹ رہے ہیں'۔ ان کا کہنا تھا کہ 'معاشرے کے معتدل اور تعلیم یافتہ افراد انصاف اور گھوٹکی میں امن کو برقرار رکھنے کے لیے ہماری کوششوں کی حمایت کریں'۔ رپورٹس کے مطابق گھوٹکی کے قریبی علاقوں میرپور ماتھیلو اور عادلپور میں بھی مظاہرے کیے گئے جہاں مظاہرین نے سڑک بلاک کی اور پولیس سے اسکول پرنسپل کی گرفتاری کا مطالبہ کیا۔

مظاہرین نے سکول میں توڑ پھوڑ کی

وزیر اطلاعات سندھ سعید غنی نے کہا کہ گھوٹکی واقعے کی ایف آئی آر گزشتہ روز درج ہو چکی ہے اور ایف آئی آر میں نامزد پروفیسر کو آج گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ عوامی جذبات کی قدر کرتے ہیں لیکن واقعہ ایک شخص کا ذاتی فعل ہے اس میں پوری ہندو برادری کا کوئی قصور نہیں ہے تاہم واقعے کی مکمل اور غیر جانب دارانہ تحقیق ہو گی اور الزام ثابت ہوا تو ملزم کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہو گی۔ صوبائی وزیر نے کہا کہ علما کرام اور عوام سے اپیل ہے کہ پرامن رہیں اور قیام امن کے لیے اپنا کردار ادا کرنے پر ہم علما کرام اور ہندو برادری کے مشکور ہیں۔

(نامہ نگار)

وراثت کے تنازع پر دس سال سے قید خاتون بازیاب

حافظ آباد صوبہ پنجاب کے ضلع حافظ آباد میں پولیس نے بھائیوں کی جانب سے جائیداد کے تنازع پر 10 سال سے ایک کمرے میں قید کی گئی خاتون کو بازیاب کرلیا۔ پولیس ترجمان احمد اجمل کے ٹیلی فون پر ایک شہری نے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر اطلاع دی تھی جس پر محکمے کے حکام نے ایک گھر پر چھاپہ مارا جہاں خاتون کو قید کیا گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وراثت کے تنازع پر خاتون کو مبینہ طور پر باندھا گیا تھا۔ علاوہ ازیں 2 افراد کے خلاف درج کی گئی فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (ایف آئی آر) کے مطابق جس شخص نے پولیس کو اطلاع دی اس کا کہنا تھا کہ خاتون کی چیخیں پوری رات پڑوسیوں کو سونے نہیں دیتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ وہ موت کے قریب ہیں۔ ایف آئی آر کے مطابق پولیس کی ٹیم کو متعلقہ مقام پر بھیجا تو انہیں گھر باہر سے بند ملا، جس پر پولیس اندر جانے کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگی تو وہاں کچھ پڑوسی جمع ہوئے، جس کے بعد ایک بھائی واپس گھر آیا اور جائے واقعہ پر موجود پولیس حکام کو 'جان سے مارنے کی دھمکی دی'۔ اس شخص کی جانب سے پولیس کو گھر میں داخل ہونے سے منع کرنے پر حکام نے دروازے کا تالا توڑا اور ایک جانب سے اندر داخل ہوئے، جہاں حکام کو ایک کمرے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں ایک خاتون ملیں، اس دوران پڑوسیوں کی جانب سے خاتون کو ان 2 بھائیوں کی بہت کے طور پر شناخت کیا گیا۔ بعدازاں پولیس نے خاتون اہلکار کی مدد سے متاثرہ خاتون کو کمرے سے باہر نکالا اور پڑوسیوں نے انہیں غسل دیا اور کپڑے تبدیل کیے جس کے بعد انہیں ریسکیو 1122 ٹراما سینٹر منتقل کردیا گیا۔ اس موقع پر پولیس نے 2 افراد کو گرفتار کرکے تعزیرات پاکستان کی دفعہ 344، 346، 498 اے، 506، 186 اور 34 کے تحت ایف آئی آر درج کرلی۔ علاوہ ازیں پنجاب کے وزیر برائے انسانی حقوق اعجاز عالم بھی اس چھاپے کے دوران موجود رہے اور انہوں نے خاتون کو یقین دہانی کروائی کہ انہیں ہر ممکن سہولت فراہم کی جائے گی جبکہ اس سفاکانہ عمل میں ملوث افراد کو سخت سزا دی جائے گی۔ واضح رہے کہ اس سے قبل اپریل میں پنجاب کے علاقے لودھراں میں پولیس نے ایک کارروائی کے دوران زنجیروں میں جکڑی ہوئی ماں اور بیٹی کو بازیاب کروایا تھا۔ پولیس نے یہ کارروائی سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی ایک ویڈیو کے بعد کی تھی، جس میں دیکھا گیا تھا کہ ایک مکان میں ایک خاتون اور اس کی بیٹی کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا۔ بعدازاں بازیاب خاتون مقصود مائی نے پولیس کو بتایا کہ شوہر اور بیٹے سے گھریلو ناچاکی پر انہیں اور ان کی بیٹی کو زنجیروں سے جکڑ کر کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ اس سے قبل ساہیوال میں کئی ہفتوں سے زنجیروں میں جکڑی اور شوہر کے تشدد کا نشانہ بننے والی خاتون کو پولیس نے بازیاب کرایا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ مشتبہ ملزم نے ساہیوال کے علاقے شیران والی گلی میں واقع مکان میں اپنی بیوی کو مبینہ طور پر 20 دن سے رکھا ہوا تھا، پولیس کو محلے والوں نے اطلاع دی اور غلہ منڈی پولیس اسٹیشن کی ٹیم نے خاتون کو بازیاب کروایا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان)

10 سالہ بچی کا ریپ، 2 'ملزمان' گرفتار

شانگلہ خیبر پختونخوا کے ضلع شانگلہ میں پولیس نے چھٹی جماعت کی طالبہ سے ریپ کے الزام میں 2 مشتبہ افراد کو گرفتار کرلیا۔ ضلع شانگلہ کے علاقے لنلونی میں پیش آنے والے مذکورہ واقعے سے متعلق ایف آئی آر درج ہونے کے بعد گرفتاری عمل میں آئی۔ اس حوالے سے بتایا گیا کہ آلپوری پولیس اسٹیشن کے اہلکاروں نے لنلوئی علاقے میں ایک گھر پر چھاپہ مار کر سلطان ولی اور رحمن الدین کو حراست میں لے لیا۔ مشتبہ ملزمان کے خلاف مقدمہ واقعے کے اگلے روز درج ہوا تھا۔ واقعے کے حوالے سے بتایا گیا کہ 10 سالہ متاثرہ لڑکی اپنے والد تازہ گل کے ہمراہ آلپوری پولیس اسٹیشن پہنچی اور زیر حراست مشتبہ ملزمان کے خلاف بیان دیا کہ اسکول سے گھر جاتے ہوئے ملزمان نے اسے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ متاثرہ لڑکی کے بیان کے مطابق 'دونوں ملزمان سلطان ولی اور رحمن الدین لڑکی کو پکڑ کر کھیتوں میں لے گئے جہاں انہوں نے بچی کا ریپ کیا'۔ متاثرہ لڑکی نے بتایا کہ 'ریپ کے بعد ملزمان نے چاقو دیکھا کر دھمکی دی اور 200 روپے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ اگر کسی کو بتایا تو قتل کردیں گے'۔ لڑکی نے گھر آکر سارا واقعہ سنایا'۔ اس ضمن میں پولیس کے ترجمان نے بتایا کہ آلپوری میں ضلعی ہسپتال کے ڈاکٹروں نے لڑکی کے ساتھ ریپ کی تصدیق کردی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ پولیس نے دونوں ملزمان کے خلاف دفعہ 376، 506، 48 اور 53 کے تحت مقدمہ درج کرکے تحقیقات کا آغاز کردیا ہے۔ سال 2016 میں خیبر پختونخوا کے ضلع نوشہرہ کے علاقے عشور آباد میں ایک 5 سالہ لڑکی کو مبینہ طور پر ریپ کے بعد گلے میں پھندا لگا کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ واقعہ عیدالفطر کے تیسرے روز پیش آیا تھا، مقتولہ کے والد کا کہنا تھا کہ ان کے گھر میں فرج نہیں، اس لیے ان کی بیٹی جمعے کے روز پڑوس سے برف لینے کے لیے گھر سے باہر نکلی تھی۔

(نامہ نگار)

پارک کے مسائل حل کیے جائیں

لاہور ایچ آر سی پی کے کونسل رکن راجہ محمد اشرف اور جنرل اسمبلی کے رکن افتخار احمد بٹ نے اپنے ساتھیوں عبدالقیوم، چوہدری محمد اسحاق اور چوہدری محمد پرویز کے ہمراہ گلشن پارک علامہ اقبال ٹاؤن کا دورہ کیا اور پارک کے پراجیکٹ ڈائریکٹر سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انہوں نے ڈائریکٹر کو پارک کے بنیادی مسائل سے آگاہ کیا اور ان کے حل پر زور دیا، انہوں نے مطالبہ کیا گلشن پارک اقبال ٹاؤن کے مسائل کے حل کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کیے جائیں:

1۔ جاگنگ ٹریک کو ٹھیک کیا جائے۔ ٹریک پر روزانہ کی بنیاد پر کیری یا باریک بجری ڈالی جائے تاکہ دھول کا خاتمہ ہوسکے۔

2۔ ٹریک کے ساتھ ڈرین کی باقاعدگی سے صفائی کی جائے تاکہ بدبو نہ آئے۔

3۔ پارک کی دونوں جھیلوں کا پانی گندا اور بدبودار ہے، اس کی صفائی کی جائے یا پانی تبدیل کیا جائے۔

4۔ پارک میں صفائی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ کینٹین کے اردگرد کے ماحول کو صاف بنایا جائے۔ کینٹین کے عملے کو پابند کیا جائے کہ وہ اردگرد کے علاقے کو رات کو ہی صاف کرکے جایا کریں تاکہ صبح آنے والوں کو خوشگوار اور صاف ستھرا ماحول میسر ہوسکے۔

5۔ پورے پارک میں صرف پانچ واٹر کولر ہیں جن میں سے صرف 2 فعال ہیں جن کا پانی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ ان تمام کولروں کی مرمت کی جائے تاکہ عوام کو ٹھنڈا اور صاف پانی میسر آسکے۔

6۔ پارک کے اندر تین بیت الخلاء ہیں جن میں سے دو فعال ہیں جبکہ ان دونوں میں بھی روشنی اور پانی کا مناسب انتظام نہیں ہے۔

7۔ لیڈیز جم کی مشینیں ٹھیک کرائی جائیں اور ان کی تعداد بڑھائی جائے۔

8۔ ارجنٹ راؤنڈ پر مزید تین بنچ رکھے جائیں، اس سے پہلے ایسے دو بنچ موجود ہیں۔

(افتخار احمد بٹ)

تھانہ ٹاؤن پولیس کی زیر حراست ڈکیتی کا ملزم جاں بحق

پشاور 3 ستمبر 2019ء کو پنجاب کے ضلع رحیم یار خان کے بعد پشاور کے ماڈل پولیس کے لاک اپ میں بھی زیر حراست ملزم جاں بحق ہوگیا۔ ملزم کو پیر کے روز ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس نے ملزم کی موت کو طبی قرار دیکر نعش پوسٹ مارٹم کے بعد ورثاء کے حوالے کردی۔ تھانہ ٹاؤن پولیس کے مطابق 2 ستمبر کو عمران اللہ نامی ملزم کو ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کیا جسے گرفتاری کے بعد حوالات میں بند کر دیا گیا تاہم منگل کے روز ملزم عمران اللہ حوالات میں مردہ حالت میں پایا گیا جس کی نعش پوسٹ مارٹم کے بعد ورثاء کے حوالے کردی گئی۔ پولیس نے بتایا کہ ملزم عمران اللہ آئس، ہیروئن کے نشے کا عادی تھا اس کی موت طبی طور پر واقع ہوئی۔

(روزنامہ ایکسپریس)

طالبہ سے زیادتی، 2 ملزم گرفتار

شانگلہ 12 ستمبر 2019ء کو شانگلہ کے علاقے لیلونئ میں 10 سالہ چھٹی جماعت کی طالبہ کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے والے دو ملزمان گرفتار کرلئے گئے۔ میڈیکلہ رپورٹ میں بچی سے ریپ کی تصدیق ہوگئی، شانگلہ کے صدر مقام الپوری تھانہ پولیس نے واقعہ کے حوالے سے بتایا کہ 10 سالہ متاثرہ بچی گزشتہ روز اپنے والد تازہ گل کے ہمراہ الپوری پولیس سٹیشن پہنچی اور مشتبہ ملزمان کے خلاف مقدمہ درج کیا جس پر پولیس نے لیلونئ کے علاقے میں ایک گھر پر چھاپہ مار کر سلطان ولی اور رحمٰن الدین کو گرفتار کیا۔ واقعہ کے حوالے سے بتایا جارہا ہے کہ دس سلہ چھٹی جماعت کی طالبہ سکول سے گھر جاتے ہوئے راستے میں ملزمان نے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا۔ (روزنامہ آج)

ہائی سکول میں سہولیات کا فقدان

خیبر 12 ستمبر 2019ء کو تحصیل باڑہ گورنمنٹ ہائی سکول زاوا اکاخیل کو 2000 میں ہائی سکول کا درجہ ملا لیکن ابھی تک نہ سٹاف اور نہ بلڈنگ ہے۔ طلباء مڈل کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کرسکتے، علاقے کے عمائدین نے میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ 2010ء میں عسکریت پسندی کی وجہ سے مکمل تباہ ہو چکا تھا۔ غیر معیاری میٹریل سے تعمیر عمارت کے بیٹھنے کا خدشہ ہے جہاں پر 600 سے زیادہ طلباء کی زندگی خطرے میں ہے، انہوں نے کہا کہ 2000ء سے ہائی سکول کا درجہ صرف کاغذی کاروائی تک محدود ہے، علاقائی مشران نے صوبائی وزیر تعلیم سے مطالبہ کیا ہے کہ تحصیل باڑہ علاقہ زاواہائی سکول بلڈنگ، ٹیچر سٹاف سمیت دیگر سہولیات ہنگامی بنیادوں پر فراہم کی جائیں تاکہ طلباء کا مستقبل تاریک ہونے سے بچایا جائے۔

(روزنامہ آج)

خاتون سمیت 2 افراد غیرت کے نام پر قتل

دیر اپر 20 ستمبر 2019ء کو واڑی کے علاقے عمرائی بالا میں فائرنگ کرکے خاتون سمیت دو افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ گزشتہ شب تحصیل واڑی کے نواحی علاقہ عمرائی بالا میں فائرنگ سے مسماۃ (ذ) زوجہ انور علی ساکن عمرائی بالا اور دوست محمد ولد زمین خان ساکن ملوئی موقع پر جاں بحق ہوگئے جن کی نعشیں پوسٹ مارٹم کیلئے واڑی ہسپتال منتقل کردی گئیں، ایس ایچ او واڑی راحت خان نے بتایا کہ دونوں کو غیرت کے نام پر قتل کیا گیا ہے، اور ملوث تین ملزمان نصیب زادہ، گل زادہ، بخت شاہ زیب پسران شمس اللہ ساکنان عمرائی کے خلاف مقدمہ درج کرلیا گیا ہے۔

(روزنامہ مشرق)

بیٹی کے ساتھ زیادتی کرنے والے دھمکیاں دے رہے ہیں

شانگلہ 13 ستمبر 2019ء کو شانگلہ کی یونین کونسل لیلونئ دنائی میں پانچویں جماعت کی 10 سالہ طالبہ کے ساتھ جنسی زیادتی کے حوالے سے متاثرہ بچی کے والد تازہ گل و دیگر ورثاء نے شانگلہ پریس کلب میں پرس کانفرنس کرتے ہوئے بتایا کہ میری بیٹی رواسیہ بی بی کو گھر آتے ہوئے راستے میں زبردستی جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا، انہوں نے کہا کہ بااثر ملزمان ہمیں دھمکیاں دے رہے ہیں خوف کے مارے متاثرہ بچی نے سکول جانا بھی چھوڑ دیا ہے ملزمان کبھی پیسوں کی لالچ دیتے ہیں اور کبھی جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں، متاثرہ خاندان نے وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا، چیف جسٹس پشاور ہائی کورٹ اور آئی جی پی سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے، حکومت واقعہ کا نوٹس لے اور ملزموں کو عبرت کا نشان بنایا جائے۔ (روزنامہ آج)

فائرنگ سے شدید زخمی لڑکی چل بسی

سوات 5 ستمبر 2019ء کو باپ کی فائرنگ سے شدید زخمی ہونے والی لڑکی پشاور کے ہسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسی۔ 19 جولائی کو ملزم ولی رحمان نے اپنے گھر میں بیٹی مسماۃ مروا اور ایک نوجوان وقاص پر فائرنگ کی تھی جس کے نتیجے میں نوجوان وقاص موقع پر جاں بحق ہوگیا تھا اور مسماۃ مروا زخمی ہوئی تھی۔ مسماۃ مروا پہلے سوات کے ہسپتال میں تھی اور بعد میں ان کو پشاور کے ہسپتال منتقل کیا گیا، جہاں وہ دم توڑ گئی۔ مسماۃ مروا کا والد ملزم ولی رحمان نے خود پولیس سٹیشن جاکر گرفتاری دی تھی جواب جیل میں ہے۔

(روزنامہ مشرق)

غیرت کے نام پر چچازاد بہن قتل

لکی مروت 4 ستمبر 2019ء کو نورنگ کے علاقے کوٹکہ غلام قادر میں چچازاد بھائیوں نے غیرت کے نام پر چچازاد بہن کو قتل کردیا، مقتولہ کے والد نے ایف آئی آر درج کراتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ گزشتہ شب ان کے بھتیجے اور رشتہ دار ملزمان حضرت علی، مصطفیٰ اور ضیاء اللہ سکنہ غلام قادر گھر آئیا وران کی بیٹی مسماۃ (ل) کو حفاظت کے نام پر ساتھ لے گئے تاہم علی الصبح وہ اس کی لاش گھر لے آئے اور کہا کہ رات کو اس نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کرلی تاہم پوسٹ مارٹم رپورٹ کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی موت زہریلی گولیاں اور گلہ دبانے سے ہوئی ہے۔ پولیس نے واقعہ کی رپورٹ درج کرکے مزید تفتیش شروع کردی۔

(روزنامہ آج)

تعلیم کے مطالبے پر نئی نویلی دلہن قتل

پشاور 15 ستمبر 2019ء کو شوہر نے مزید تعلیم جاری رکھنے کے مطالبے پر بارہویں جماعت کی طالبہ نئی نویلی دلہن کو قتل کردیا۔ سوات کی تحصیل کبل کے علاقے کانجو میں تین ماہ قبل شادی ہونے والی بارہویں جماعت کی طالبہ ثناء گل کو اس کے شوہر نے مزید پڑھائی جاری رکھنے پر قتل کردیا، مقتولہ بارہویں جماعت کی طالبہ تھی جس نے اچھے نمبروں کے ساتھ گیارویں کلاس کو پاس کیا تھا، مقتولہ مزید پڑھنا چاہتی تھی مگر ان کے شوہر اور مبینہ قاتل انس کو ان کی مزید پڑھائی منظور نہیں تھی جس پر نئی نویلی دلہن کی جان لی گئی۔

(روزنامہ آج)

کیا پولیس ٹھیک ہوسکتی ہے؟ نوآبادیاتی دور سے پاکستان تک ایک جائزہ

عامر ریاض

آج پولیس تشدد پر ہم سب مضطرب ہیں اور ہر آئے روز ایک نئی خبر سے ہمیں پالا پڑ رہا ہے۔ لوگوں کو لاپتہ کرنا، ماورائے قانون قتل، عقوبت خانے چلانا، مخالفین کو جعلی کیسوں میں پھنسانا، انہیں غدار یا دہشت گرد قرار دلوانا، وہ معاملات ہیں جن کی ایک سو (100) سال سے طویل تاریخ ہے۔

اس سب کے پیچھے جو مائنڈ سیٹ اور تال میل ہے اسے سمجھے بغیر اصلاحات کا کوئی ایجنڈا پایہ تکمیل کو پہنچ ہی نہیں سکتا۔

جنوبی ایشیائی ریاستوں خصوصاً بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان میں جدید ریاستی محکمے اور ادارے نوآبادیاتی آقاؤں نے بنائے کہ جن میں عوام کو سٹیزن (یعنی شہری یا باسی) کے بجائے محکوم یا رعایا سمجھا جاتا تھا۔

قبل از انگریز عہد میں ان فارمل (غیر روایتی) عدم مرکزیت کا دستور عام تھا۔ اس بات کو سمجھنے سے پہلے ہمیں قبل اور بعد از انگریز دور کے فرق کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

ٹیکس اکٹھا کرنا ہوتا، تعلیم اور انصاف کا مسئلہ ہوتا یا جنگ کے لیے بھرتیاں کرنی ہوتیں، یہ سب مرکز کی مداخلت کے بغیر ممکن تھے۔ مدارس، پٹ شالائیں، گردوارے، خانقاہیں اور تعلیم دینے والے دیگر ادارے قومی نصاب کے بغیر کام کرتے تھے۔ جب بادشاہ کو کسی مہم میں فوج اکٹھا کرنی ہوتی تھی تو وہ پنج ہزاری اور اٹھ ہزاری عہدیداروں کو حکم جاری کرتے تھے یا پھر جتھے داروں کو فوجی یا سپاہی بھرتی کرنے کا کہتے تھے۔ جتھے داری سسٹم اورنگزیب کے بعد پنجاب سے کابل تک بنا تھا اور یہ 1849ء تک چلتا رہا تھا۔

پرانے بندوبست کے برعکس جدید نوآبادیاتی ریاست کا بنیادی کلمہ ہی مرکزیت پسندی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نوآبادیاتی ریاست کے تحت بنائے گئے تمام تر محکموں اور اداروں میں مربوط مرکزیت پسند نظام بدرجہ اتم موجود تھا۔

29 مارچ 1849ء کو جب نوآبادیاتی آقاؤں نے رنجیت سنگھ کی بادشاہت 'لہور دربار' کو گرایا تھا تو انگریزوں کا برٹش انڈیا پر قبضہ مکمل ہوگیا تھا۔ اس قبضے کے بعد انگریزوں نے مرکزیت پسند ڈھانچہ بنانے کا کام شروع کیا۔ یہ ڈھانچہ 1850ء کیریلوے اور لوکل باڈیز ایکٹ سے شروع ہوا اور تعلیم کے حوالے سے 1854ء کے ووڈز ڈسپیچ سے ہوتا ہوا براستہ امپیریل سول سروس یعنی آئی سی ایس، پولیس ایکٹ 1861ء تک پہنچا۔

> **1930ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جا کر 1901ء میں بنائے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کو صوبائی اختیارات ملے اور انہی سالوں میں سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبہ بنایا گیا۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مرکزیت پسند ڈھانچے کا اچھا اور بُرا اثر موجودہ پاکستان میں جتنا پنجاب نے بھگتا اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس ڈھانچے سے سب سے زیادہ فائدہ جن مقامیوں نے اٹھایا ان میں سرِ فہرست بنگالی تھے جنہیں برٹش انڈیا کے باسی اسی تعلق کی وجہ سے 'بابو' بھی کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور بنگال میں اس کا ردِعمل بھی فقید المثال رہا۔**

19ویں صدی کے آخری عشروں میں 3 اہم فیصلے کیے گئے کہ 1882ء میں لوکل باڈیز ریفارمز کے تحت مخصوص طبقات کو محدود حقِ رائے دہی دیا گیا تو 1894ء میں ڈیورنڈ لائن کھینچی گئی اور پھر علاقائی فوجیں ختم کر کے برٹش انڈین آرمی بنائی گئی۔

1901ء کے بعد اس ڈھانچے میں ایک مربوط انٹیلی جنس سسٹم کا اضافہ ہوا جو دھیرے دھیرے تمام ڈھانچے پر چھا گیا۔ اس ضمن میں پیٹرک فرنچ کی کتاب 'لبرٹی اینڈ ٹیتھ' میں شافی معلومات مجتمع کی گئی ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ ڈھانچہ بنایا جا رہا تھا تو سندھ بمبئی پریذیڈنسی کے زیرِ انتظام تھا، بلوچستان قبائلی علاقہ تھا اور موجودہ خیبر پختونخوا اور دلّی صوبہ پنجاب میں تھے جبکہ برٹش انڈیا کا مرکز بنگال میں شہر کلکتہ تھا۔

1930ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں جا کر 1901ء میں بنائے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کو صوبائی اختیارات ملے اور انہی سالوں میں سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے صوبہ بنایا گیا۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس مرکزیت پسند ڈھانچے کا اچھا اور بُرا اثر موجودہ پاکستان میں جتنا پنجاب نے بھگتا اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ اس ڈھانچے سے سب سے زیادہ فائدہ جن مقامیوں نے اٹھایا ان میں سرِ فہرست بنگالی تھے جنہیں برٹش انڈیا کے باسی اسی تعلق کی وجہ سے 'بابو' بھی کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب اور بنگال میں اس کا ردِعمل بھی فقید المثال رہا۔

بابوؤں کی جو فصل نوآبادیاتی آقاؤں نے ہماری سرزمین پر کاشت کی اس کا خمیر اسی مرکزیت پسند ڈھانچے پر اٹھایا گیا اور اس کی قباحتیں بالعموم پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کی بیوروکریسی، سیکیورٹی اداروں، عدالتوں وغیرہ میں آج بھی موجود ہیں۔ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی حاکمیت میں چلنے والے اس بندوبست میں پولیس، پٹواری، استاد اور سول جج اس مرکزیت پسند ڈھانچے کا وہ چہرہ تھا جس کا عوام سے براہِ راست پالا پڑتا تھا کہ پچھلی صدی کی دوسری دہائی میں اس میں ڈسٹرکٹ انٹیلی جنس افسر کا اضافہ ہو چکا تھا۔

بظاہر یہی لگتا ہے کہ یہ خودمختار محکمے ہیں مگر ان کی ترکیب ایسے بنائی گئی ہے جس میں یہ ایک دوسرے سے ایسے باہم پیوستہ ہیں کہ کسی ایک کو دوسروں سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب ان میں ریفارمز یا اصلاحات کرنے کی کوشش ہوئی ہے ان میں مزید بگاڑ ہی پیدا ہوا ہے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں کسی نہ کسی شکل میں یہ بندوبست آج بھی چل رہا ہے۔ اس تمام تر تفصیل کو لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس پس منظر کو سمجھا جائے جس کی ایک پیداوار پنجاب پولیس بھی ہے۔

20ویں صدی کے ابتدائی عشروں سے جب محدود حق رائے دہی کے تحت ڈسٹرکٹ بورڈوں اور صوبائی اسمبلیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو اس کے خلاف سب سے بڑی مزاحمت اسی ڈھانچے کی طرف سے آئی کہ پاور شیئرنگ کے لیے یہ تیار نہیں تھا۔ ان اسمبلیوں میں آنے والے اس ڈھانچے کی خامیوں اور قباحتوں کو جانتے تھے اور انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ یہ ریاستی ڈھانچہ کیسے کیسے عوام اور سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال ہوتا ہے اور سیاسی کارکنوں پر غداری اور دہشت گردی کے کیس ڈالتا ہے اور عدالتوں سے سزائیں بھی دلوائی جاتی ہیں۔

یوں ان خدمات کے عوض ان محکموں سے جڑے افراد کی ذاتی دشمنیاں نکالنے اور دیگر غیر قانونی کام کرنے کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ اس پورے نوآبادیاتی ڈھانچے میں کس قدر مالی کرپشن تھی اس کی ایک مثال مشہور عبقری اور اورنگی پائلٹ پراجیکٹ کے بانی اختر حمید خان کا استعفیٰ ہے۔

آپ 1936ء میں آئی سی ایس افسر بنے تھے۔ بطور آئی سی ایس افسر آپ نے برٹش پنجاب میں جاری کوآپریٹوز کے بندوبست کو مثالی قرار دیا تھا مگر جب انہیں 1943ء میں بنگال کے قحط کے دوران بطور آئی سی ایس افسر کام کرنا پڑا تو یہ درویش صفت خاموش نہ رہ سکا اور لکھا کہ 'اس محکمے میں اتنی کرپشن ہے کہ یہ مرنے والوں کا مال بھی نہیں چھوڑتے'۔

کروفر، کرپشن اور مخالفین کو غداری کے سرٹیفکیٹ دینے والا یہ بدبودار ڈھانچہ ہمیں ورثے میں ملا اور یہی وجہ ہے کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ، چٹاکانگ اور کراچی میں براجمان بیوروکریسی کو خود کو بدلنے اور بدل چکے وقت سے سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ 25 مارچ 1948ء کو چٹاکانگ پہنچے اور کہا 'ایک انقلابی تبدیلی آچکی ہے۔ آپ کا تعلق کسی بھی گروہ، مذہب، فرقے، ذات سے ہو مگر اب آپ صرف پاکستان کے سرونٹ ہیں۔ سرونٹ کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے فرائض سر انجام دے اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے۔ وہ دن چلے گئے جب اس ملک میں بیوروکریسی کی حکومت ہوتی تھی۔ اب یہاں ایک عوامی سرکار ہے جو جمہوری اور پارلیمانی حوالوں سے لوگوں کو جوابدہ ہے'۔

قائدِ اعظم کو تو اتنی مہلت نہ ملی مگر ان کے پیش رو باوجوہ پرانے سسٹم اور گلے سڑے ڈھانچے کو چلاتے رہے۔ قائدِ اعظم نے تو بیوروکریسی سے کہا تھا کہ 'نہ تو آپ کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق ہے اور نہ ہی آپ حکمران ہیں بلکہ آپ صرف لوگوں کے خادم ہیں'۔ مگر جب مارچ 1951ء میں ملک میں پہلے صوبائی الیکشن کا وقت آیا تو اسی پرانے ڈھانچے کی مدد سے پنجاب میں مخالفین کو ہروایا گیا۔

اس کھیل کا آغاز قراردادِ مقاصد کی ہشیار منظوریوں سے قبل ہی ہو چکا تھا جب 25 جنوری 1949ء کو بظاہر کرپشن کے الزام لگا کر افتخار حسین ممدوٹ کی حکومت توڑ کر گورنر راج لگایا گیا تھا اور پھر مارچ 1949ء کے دوسرے ہفتے مسلم لیگ کے برٹش بنگال میں آخری وزیرِ اعلیٰ حسین شہید سہروردی کی اسمبلی رکنیت ختم کرتے ہوئے انہیں غدار اور بھارتی ایجنٹ کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

> کروفر، کرپشن اور مخالفین کو غداری کے سرٹیفکیٹ دینے والا یہ بدبودار ڈھانچہ ہمیں ورثے میں ملا اور یہی وجہ ہے کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ڈھاکہ، چٹاکانگ اور کراچی میں براجمان بیوروکریسی کو خود کو بدلنے اور بدل چکے وقت سے سیکھنے کا مشورہ دیا۔ وہ 25 مارچ 1948ء کو چٹاکانگ پہنچے اور کہا 'ایک انقلابی تبدیلی آچکی ہے۔ آپ کا تعلق کسی بھی گروہ، مذہب، فرقے، ذات سے ہو مگر اب آپ صرف پاکستان کے سرونٹ ہیں۔ سرونٹ کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے فرائض سر انجام دے اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے۔ وہ دن چلے گئے جب اس ملک میں بیوروکریسی کی حکومت ہوتی تھی۔ اب یہاں ایک عوامی سرکار ہے جو جمہوری اور پارلیمانی حوالوں سے لوگوں کو جوابدہ ہے'۔

بات یہاں پر رکی نہیں بلکہ پنجاب میں انتخابات سے ایک دن قبل آئی جی پنجاب نے فوج میں ایک بڑی سازش پکڑنے کا انکشاف کیا جس کا الزام ایسے فوجیوں پر لگا جو کشمیر پر حکومتی پالیسی کے ناقد تھے۔ پاکستان کے پہلے آرمی چیف جنرل گریسی جاتے جاتے جن 'ینگ ٹرکس' سے بچنے کی جنرل ایوب کو ہدایت کر گئے تھے اس پر عمل درآمد کے لیے ایوب خان کو بیوروکریٹ قربان علی خان ہی کی مدد لینی پڑی۔

ایک ایسا وقت جب آئین بنانے کے بعد نوآبادیاتی ڈھانچے کو بدلنا اولین ترجیح ہونی چاہیے تھی مگر حکمران اسی مرکزیت پسند ڈھانچے کے اسیر بنے رہے۔ حکمران ٹولے کے ستائے ممدوٹ اور سہروردی اکٹھے ہوئے، جناح عوامی مسلم لیگ بنائی اور الیکشن میں پنجاب سے یہ جماعت 175 میں سے محض 32 ہی لے سکی مگر اخبارات نے اگلے روز جھرلو کی سرخی بنائی۔ اس جھرلو میں سول بیوروکریسی اور پولیس نے کلیدی کردار ادا کیا۔

تادمِ تحریر یہ کھیل کم و بیش جاری ہے کہ 2018ء عوام کو سبجیکٹ کی بجائے شہری یا باسی یعنی سٹیزن سمجھا جائے کے انتخابات اس کی تازہ ترین مثال ہیں۔ تاہم اس میں گزرتے وقت کے ساتھ ڈپٹی کمشنر، کمشنر، بیوروکریٹ اور پولیس والے مختار کل نہ رہے بلکہ نئے کھلاڑیوں کے نقیب بن گئے۔ یوں نئے اور پرانے کھلاڑیوں کے ملاپ اور تکرار میں پرانا مرکزیت پسند ڈھانچہ تبدیلی کے راستے پر گامزن ہونے کی بجائے مزید بگاڑ کی طرف بڑھ گیا۔

بار بار لگنے والے مارشل لا نے بھی اس میں حصہ بقدرِ جثہ ڈالا مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اشرافیہ بھی کبھی ساتھ مل کر اور کبھی مزاحمت کرتے ہوئے اپنا اثر بڑھاتی رہی۔

1980ء کی دہائی کے بعد طاقت کی غلام گردشوں میں میڈیا، وکلا، پروفیشنلز سمیت نئے مفاداتی گروہ بھی نظر آنے لگے۔ لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور، اسلام باد، راولپنڈی، حیدرآباد، فیصل آباد، ملتان، گجرانوالہ، سیالکوٹ، سکھر کو نکال کر باقی کل اضلاع میں پرانا بندوبست نسبتاً بہت طاقتور ہے۔ ایوب خان سے مشرف تک جب بار بار عدم مرکزیت کو مخصوص طریقے سے استعمال کیا گیا تو خود عدم مرکزیت بھی اک مذاق بن گئی۔

اس مرکزیت پسند ڈھانچے کے کسی ایک کل پرزے یا محکمے کی اصلاح کرنا بظاہر بڑا سہانا خواب لگتا ہے اور اس سراب نے بہت سے اعلیٰ اذہان کو بھی متحرک و متاثر کیا مگر ہر بار اس میں مزید بگاڑ ہی ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے موقر سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے نئے سماجی سمجھوتے یعنی نیو سوشل کنٹریکٹ کی بات کی۔ ایسا کنٹریکٹ جس میں اور انہیں ہر سطح پر فیصلوں میں شامل کرنے کے وسیع مواقع ہوں۔

پولیس کو ٹھیک کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے مگر پولیس اس نظام کا محض ایک کل پرزہ یا محکمہ ہے۔ ایک زمانے میں اسے محض سول بیوروکریٹ چلاتے تھے تو آج اس کو چلانے والے نصف درجن سے زیادہ ہیں۔ جس نظام کا یہ حصہ ہے اس کا خمیر مرکزیت پسندی سے اٹھایا گیا ہے اور پاور شیئرنگ کو یہ گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔

یہ مائنڈ سیٹ کیا محض پولیس ہی کا ہے؟ اگر آپ تھانیدار کی جگہ ایس پی یا اس سے بڑے رینک والے افسر کو بھی بٹھا دیں گے تو صورتحال یہی رہے گی۔ اصلاحات کی ضرورت اس پورے سسٹم میں ہے جس میں عدالتیں، سیکیورٹی ادارے اور بیوروکریسی شامل ہے مگر اصلاحات کے لیے تصفیہ اور تسلسل پہلی شرط ہے۔

(بشکریہ ڈان اردو)

> **20** ویں صدی کے ابتدائی عشروں سے جب محدود حق رائے دہی کے تحت ڈسٹرکٹ بورڈوں اور صوبائی اسمبلیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو اس کے خلاف سب سے بڑی مزاحمت اسی ڈھانچے کی طرف سے آئی کہ پاور شیئرنگ کے لیے یہ تیار نہیں تھا۔ ان اسمبلیوں میں آنے والے اس ڈھانچے کی خامیوں اور قباحتوں کو جانتے تھے اور انہیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ یہ ریاستی ڈھانچہ کیسے کیسے عوام اور سیاسی مخالفین کے خلاف استعمال ہوتا ہے اور سیاسی کارکنوں پر غداری اور دہشت گردی کے کیس ڈالتا ہے اور عدالتوں سے سزائیں بھی دلوائی جاتی ہیں۔

پاکستان میں پڑھا لکھا کون ہے؟

انجم الطاف

لکھاری لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (لمز) کے شعبہ برائے ہیومینٹیز، سوشل سائنسز اور قانون کے ڈین رہ چکے ہیں۔

تعلیم کیا ہے؟ یہ ہم اس وقت تک نہیں سمجھ پائیں گے جب تک علم، ہنر اور سند جیسے اس کے مختلف پہلوؤں کے درمیان فرق کو سمجھ نہیں لیتے۔

یہ پہلو ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس مثال پر غور کرنا پڑے گا۔ میں اپنی گاڑی مرمت کروانے ایک 'چھوٹے' کے پاس لے گیا جو پہلے ایک 'استاد' کے ہاں شاگرد تھا اور اس نے اسی سے ہی اس کام میں مہارت حاصل کی۔ چھوٹے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جدید شہری طور طریقوں سے بھی بخوبی واقف ہے لیکن اس کے باوجود لوگ اسے تعلیم یافتہ تصور نہیں کرتے۔ آخر کیوں؟

آج 'تعلیم یافتہ' شخص ہونے کا تصور ابہام کا شکار بن چکا ہے جبکہ اسے سمجھنے کے طریقے میں بھی کافی تضاد پایا جاتا ہے۔

روایتی خیال کے مطابق ہر وہ شخص پڑھا لکھا ہے جو علم رکھتا ہے اور اس کا علم اس شخص کے ایسے مضامین پر ذہانت بھری گفتگو کا حصہ بنتے وقت ظاہر ہوتا ہے جن کا کسی پیشہ ورانہ مہارت یا پیشے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرنا چاہتا ہے تو اس کا مطالعہ بہتر ہونا چاہیے اور وہ کم از کم ایک زبان میں روانی رکھتا ہو جس میں وہ اپنے خیالات کو باربط انداز میں الفاظ کی صورت دے کر ان کا اظہار کر سکے۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ افراد کو مہذب و شائستہ کہا جاتا تھا، یعنی علم کا حصول پورا پورا دھیان رکھتے ہوئے اگائی گئی کھیتی جیسا عمل ہے جس میں کڑی محنت اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

چھوٹا انتہائی ہنرمند ہونے کے باوجود بھی محدود علم کی وجہ سے غیر تعلیم یافتہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں معاملہ تھوڑا ٹیڑھا نظر آتا ہے۔

آج کے پاکستان میں چھوٹے کو کئی دیگر افراد کا متبادل تصور کیا جا سکتا ہے۔ چھوٹا گاڑیوں کی مرمت کرنے والا ٹھیک ویسا ہی ایک باہنر مکینک ہے، جیسے انسانی جسم، کمپیوٹر اور کمپنی لیجرز وغیرہ کے دیگر مکینکس پائے جاتے ہیں۔

مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کے مضامین نے جب سے ان مضامین کی جگہ لی جو سوچنے کی حوصلہ افزائی پیدا کرتے تھے تب سے ہمارے کالجوں نے ایسے لوگ پیدا کرنا شروع کر دیے ہیں جو معقول حد تک باصلاحیت تو ہیں مگر روایتی فہم میں کچھ اچھے تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ کئی ڈاکٹرز، انجینئرز، اکاؤنٹنٹ اور فوجی اہلکار اسی زمرے میں شمار ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے شدید نقصان سے دوچار ہے۔

اگر چھوٹے کی بات کی جائے تو یہ اپنے دائرہ کار میں بہت ایماندار ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ دیگر ممالک آگے نکل گئے ہیں، پاکستان کیوں پیچھے رہ گیا؟ تو اس کا عمومی طور پر جواب یہی ہوگا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

اس کے برعکس ڈاکٹروں، انجینئروں، اکاؤنٹنٹ اور فوجی اہلکاروں کے پاس ہمیشہ ہر سوال کا جواب دستیاب ہوتا ہے۔ وہ آپ کو فوراً جواب دیں گے کہ ملک کے پیچھے رہ جانے کی وجہ تعلیم کی کمی، بڑھتی ہوئی آبادی یا کرپشن میں اضافہ یا اچھی قیادت کی کمی یا پھر ایمان سے محرومی ہے۔

اگر انہیں زیادہ بات کرنے پر اکسایا جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ اچھی قیادت کی عدم موجودگی کی وجہ کیا ہے تو گفتگو کا آغاز و انجام اللہ کی مرضی پر ہوگا۔ اگر پوچھا جائے کہ بھارت کی آبادی ہم سے 6 گنا زیادہ ہے مگر پھر بھی وہاں حالات ہم سے بہتر کیوں ہیں؟ تو شاید ان کی جانب سے آپ کے علم میں یہ اضافہ کیا جائے کہ بھارتی مختلف ہیں اور بنگلہ دیشی پاکستان کو اس لیے پیچھے چھوڑ رہے ہیں کیونکہ یہ ہمیشہ سے پُر فریب رہے ہیں۔

چھوٹے کو محض اس لیے بھی غیر تعلیم یافتہ تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس کوئی ڈگری یا ڈپلومہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے اسکولوں میں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے اسے دیکھیں تو وہ خوش قسمت ہی رہا کہ اسکول نصاب میں شامل مخصوص نظریات و خیالات کی تعلیم سے بچ گیا۔

پھر اگر اسے اپنی کاریگری کی سند کے حصول پر مجبور کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ وہ سند کہیں سے خرید لے گا کیونکہ ڈگری کس قدر قابلِ بھروسہ ہے اس بات کو کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔

تاہم اس خطا پر پشیمان کیونکر ہو کہ ایسا کرنے والا وہ اکیلا تو نہیں، ہماری کئی معزز و محترم شخصیات ایسی ہیں جو اپنی ملازمت کے معیار پر پورا اترنے کے لیے جعلی اداروں سے ایڈوانس ڈگریاں خرید چکی ہیں، جبکہ تعلیم کے مانیٹرنگ ادارے ایچ ای سی کے سابق ڈائریکٹر سمیت کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے مقالے کہیں سے چوری کیے ہیں۔ ملک میں تعلیمی بحران کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیے؟

یہاں میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ حقیقی تعلیم یافتہ بس وہی ہیں جو اچھے یا با اخلاق ہوں۔ کوئی فرد اپنی حاصل کردہ تعلیم سے کیسا تعلق رکھنا چاہتا ہے یہ اس کی اپنی مرضی ہے، چاہے اسے اپنی ذاتی زندگی میں شامل رکھے یا پھر مروجہ اقدار کے مطابق ان کا استعمال کرے۔

پڑھے لکھے لوگوں میں خوشامد کرنے والوں، مافیا کے ساتھ کام کرنے والوں اور جنسی طور پر ہراساں کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ضرور موجود ہے جو ان میں مذکورہ خاصیتوں سے عاری دکھانے کے لیے کافی ہیں۔ میں نے حال ہی میں ایک ایسی والدہ کے بارے میں سنا جو ایک کورس میں ناکام ہونے والے اپنے بیٹے سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ نتیجہ تبدیل کرنے کے لیے کتنی رقم درکار ہوگی۔

مذکورہ تمام باتوں کے باوجود علم و آگاہی اور صاحبِ فکر شہریوں کی اہمیت سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اب ہم بادشاہوں اور خود سے خود کو نجات دہندہ مقرر کرنے والوں کے زمانے میں نہیں رہتے بلکہ جمہوری نظام میں رہتے ہیں، اور اس میں ہمیں اپنے نمائندگان چننے کے لیے دلائل پر مبنی سوچ بچار کے بعد معقول فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ اگر شہری کھوکھلی بیان بازی اور حقیقت میں فرق کرنا نہ جانتے ہوں تو مستقبل تاریکیوں میں ڈوب جائے گا۔

اقتصادی ترقی کے لیے لیبر فورس کا سوچنے اور علم کو سمجھنے کی صلاحیت کا حامل ہونا نہایت ضروری ہے، تاہم اس ترقی کے لیے یہ صلاحیت ضروری تو ہے لیکن کافی نہیں۔

اگر حکومتی پالیسیوں کے باعث تنزلی آتی ہے تو لیبر فورس خود سے اسے ٹھیک نہیں کر سکتی، بلکہ یہ صرف پالیسی کی تبدیلی کے لیے اپنے ووٹ کا استعمال کر سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر اقتصادی پالیسیاں ترقی کی طرف لے جاتی ہیں تو علم و فہم رکھنے والی لیبر فورس اس لیبر فورس کے مقابلے میں مواقع سے زیادہ مؤثر انداز میں فائدے اٹھا سکتی ہے جو فکری و تخلیقی صلاحیت نہیں رکھتے۔

یاد رکھیے کہ صرف ترقی یافتہ معیشت کے تناظر میں ہی حصولِ ہنر کے طور پر تعلیم کا پہلو با مقصد بنتا ہے۔ معیشت کی فطرت کو مخصوص ہنر اور انہیں انجام دینے والے ایسے افراد مطلوب ہوتے ہیں جو زندگی بھر اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکیں۔

بدلے میں لیبر مارکیٹ کے مطالبات تعلیمی اداروں کی جانب سے کروائے جانے والے تربیتی پروگرامز کی فراہمی میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ٹانگا گاڑی کو گھوڑے کے آگے نہیں لگایا جا سکتا، اس لیے یہ امید کرنا کہ سائنس کے مضمون میں پی ایچ ڈیوں کی بھرمار یا کثیر تعداد میں ڈپلوما کی اسناد کی تقسیم سے ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوں گے، یہ ایسا خیال ہے جسے چھوٹا بھی ایک احمقانہ خیال قرار دیتا ہے۔

اس تناظر میں آپ برطانیہ میں آنے والے صنعتی انقلاب اور امریکا میں آنے والے دی گریٹ ڈپریشن کی دو متضاد مثالوں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

صنعت کاری کی آمد سے قبل برطانیہ میں غربا کی تعلیم کو تقریباً عالمگیر مخالفت دیکھنے کو ملتی تھی، پھر اسی صنعت کاری کے باعث ایسی ملازمتوں کی بڑھتی طلب پیدا ہوئی، جس میں خواندگی، روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے اعداد اور ان کے حساب سے واقفیت، حساب کتاب کا ریکارڈ رکھنے کی صلاحیت اور ایسی دیگر صلاحیتوں کی مانگ کی گئی۔

گریٹ ڈپریشن کے دوران ملازمتوں کے مواقع غائب ہوتے رہے اور بہتر سے بہترین تعلیم بھی اس سلسلے کو روک نہیں پائی۔

اس پوری بحث کا حاصل یہی ہونا چاہیے کہ تعلیم بطورِ علم بہتر طرزِ حکمرانی و اقتصادی ترقی کے لیے نہایت اہم ہے، اور اس کی کھیتی ہائی اسکول کے ذریعے کی جانی چاہیے۔

حصولِ ہنر کے تناظر میں تعلیم اگرچہ ضروری تو ہے لیکن اس سے خوبخود ملازمت کے مواقع پیدا نہیں ہو سکیں گے۔ سب سے زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ ترقی بہتر پالیسیوں کا تقاضا کرتی ہے اور اس کا متبادل حصولِ ہنر نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی حکومتوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کون سے ہنر کو فروغ ملنا چاہیے بلکہ یہ فیصلہ عام افراد پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہی عام افراد اقتصادی مواقع پر اپنا ردِعمل دیتے ہیں اور اسناد کی اندھا دھند تقسیم سائے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

(بشکریہ ڈان)

بھائی کب تک وراثتی جائیداد سے بہنوں کا حصہ کھاتے رہیں گے؟

مبشر مجید

پاکستان کا آئین و قانون عورت کو وراثتی حقوق دلانے کا پابند ہے۔لیکن اسی معاشرے میں بہن کا وراثتی حق مختلف حیلے بہانوں سے چھینا جھپٹا جاتا ہے۔ بہن کا وراثتی حق چھیننے کے لیے کبھی اُسے قتل، کبھی زور زبردستی، کبھی پیار اور صلح سے اور کبھی تو اس کی شادی قرآن تک سے کروادی جاتی ہے۔

وراثتی حق پر سگے بھائی کیسے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اس بات کو وہاڑی کے نواحی گاؤں 19 چک کی بڈھائی بی بی سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔

کہانی یوں ہے کہ 45 سال قبل جن بھائیوں نے بڈھائی بی بی کو محمد یار کے ساتھ قرآن کے سائے میں گھر سے رخصت کیا وہی اب اُس سے اُس کا وراثتی جائیداد میں شرعی اور قانونی حق چھیننے کے درپے ہیں۔

بڈھائی بی بی اپنی روداد سُناتے ہوئے بتاتی ہیں کہ شادی کے بعد جب بھی ان کے ہاں اولاد پیدا ہوتی تو چند روز بعد بچے کا انتقال ہو جاتا۔اس صورتحال سے وہ اور اس کا خاوند محمد یار بہت پریشان تھے۔آخر 25 سال قبل اللہ نے ان کی سن لی اور ان کا بیٹا زندہ بچ گیا۔اسی وجہ سے اس بیٹے کا نام اللہ رکھا رکھ دیا گیا۔مگر افسوس قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔زندہ بچ جانے والے بیٹے کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد خاوند ہی چل بسا۔

خاوند کی وفات کے بعد معاشی مشکلات نے بڈھائی بی بی کے گھر ڈیرے ڈال لیے اور زندگی گزارنا انتہائی دشوار ہو گیا۔لیکن بڈھائی بی بی نے ہمت نہ ہاری۔اُس نے نا صرف اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش کی بلکہ اس کو پڑھایا لکھایا بھی۔ اپنی ہمت اور ماں کی کوششوں سے وہ نوجوان پاکستان کا نیشنل اتھلیٹ بنا۔

بیٹے نے ماں کو بتایا کہ اپنی محنت اور ٹیلنٹ کی بناء پر اسے بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لینے باہر جانا ہے۔لیکن بین الاقومی مقابلوں میں شرکت کے لئے اُسے پیسوں کی ضرورت ہے۔اگر پیسے نہ ہوں تو وہ ان مقابلوں میں شرکت کے لئے نہیں جا سکے گا۔اب مسئلہ یہ تھا کہ ان کے پاس تو گھریلو معمولات زندگی گزارنے کے اخراجات ہی بمشکل سے پورے ہوتے تھے باہر کے خرچے کیسے پورا کرنا ہوں گے۔

بڈھائی بی بی کیلئے امید کی ایک ہی کرن تھی اور وہ تھی اپنے بھائیوں سے اپنی وراثتی جائیداد میں اپنے وارثتی حصے کا تقاضا۔اُس نے بیٹے کو تسلی دی اور کہ اکہ اس کے بھائی بہت اچھے ہیں اور وہ ان سے اپنے وراثتی زمین میں حصے کا مطالبہ کرے گی جسکی مالیت لاکھوں میں ہے۔اس طرح وہ اپنی وراثتی جائیداد کو بیچ کر اپنے بیٹے کے سپنے ضرور پورا کرے گی۔ لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وراثتی حق مانگنے پر فرشتہ صفت بھائی درندہ صفت بن جائیں گے اور بہن کے مقدس رشتے کا لحاظ بھی بھول جائیں گے۔

ملزمان نے دھمکی دی ہے کہ وہ پولیس کو پیسے دے کر بے گناہ ہو جائیں گے اور بعد میں ماں کے ساتھ ساتھ اُسے بھی قتل کریں گے۔"اللہ رکھا"

بڈھائی بی بی نے بتایا کہ اس کے والد نے وراثت میں دو مختلف جگہوں پر 22 ایکڑ سے زائد زمین چھوڑی تھی۔جس میں اس کا حصہ قریباً اڑھائی ایکڑ بنتا ہے۔اور دونوں جگہ کی مختلف قیمتوں کے حساب سے اس کے حصہ میں تقریباً چالیس لاکھ سے زائد کی زمین آتی ہے۔

ماں اپنے بیٹے کو خوشی خوشی بھائیوں کے پاس لے کر آئی اور ساری بات کہہ ڈالی۔توقع کے مطابق انہوں نے حصہ دینے کی حامی بھی بھر لی۔لیکن معاملہ کو مختلف بہانوں سے لٹکانے لگے۔

کئی ماہ گزرنے کے بعد جب بہن نے ذرا ناراضگی کا اظہار کیا تو بھائیوں نے قطع تعلق کر لیا اور وراثتی حصہ دینے میں بھی لیت ولعل سے کام لینے لگے۔آخر ایک دن بھائیوں نے بہن کو اپنے گھر بلایا کہ زمین کے حصے کا فیصلہ کر کے زمین اپنے نام کروالو۔

بھولی بھالی بہن خوشی سے بھائیوں کے ہاں چلی گئی۔ جہاں دونوں بھائیوں محمد حسین اور رحمت علی نے بہن کے لئے کچھ اور ہی سوچا ہوا تھا۔ بڈھائی بی بی کے مطابق بھائی محمد حسین جو کہ ایک عطائی ڈاکٹر ہے، نے بھائی رحمت علی، بھابھی کلثوم بی بی اور بھتیجی مریم بی بی کی مدد سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیہوشی کا انجکشن لگایا جس سے میں نیم مردہ ہو گئی۔تب انہوں نے میرے حصے کی زمین پر نیم بیہوشی کے عالم میں مختلف کاغذات پر انگوٹھے کے نشانات لگوائے۔بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد ٹوکے اور چھرے کی مدد سے مجھے قتل کرنے کے لئے جسم کے مختلف حصوں پر کاری ضربیں لگائیں۔

اپنی طرف سے تو وہ مجھے قتل کر کے پھینک گئے تھے۔لیکن میری سانسیں باقی تھیں۔کئی گھنٹوں بعد جب مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ، پاؤں، سر، چہرے اور جسم کے مختلف حصوں پر گہرے گھاؤ تھے۔جن سے خون بہہ رہا تھا۔ہمت جمع کر کے باہر نکلی تو لوگ جمع ہوئے۔ پولیس اور ایمبولینس کو بلایا۔

تب مجھے ایک آنکھ سے ہی نظر آ رہا تھا۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ گہری چوٹ کے باعث میری ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔سر کی مختلف ہڈیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ایک ہاتھ انگلیوں سے کٹ چکا ہے اور جسم کے دیگر حصوں پر شدید زخم ہیں۔ڈیڑھ ماہ علاج ہوا اور تقریباً آٹھ لاکھ روپے خرچہ ہوا۔علاج کے کچھ پیسے مخیّر حضرات نے دیے اور باقی قرضہ لے کر پورے کیے۔

بڈھائی بی بی کے بیٹے نیشنل اتھلیٹ اللہ رکھا نے بتایا کہ جس والدہ نے میری خاطر اتنی قربانیاں دیں اُس پر چند لاکھ روپوں کی خاطر بے پناہ ظلم کیا گیا۔

والدہ کے اُپر ہونے والے ظلم پر پولیس تھانہ صدر، وہاڑی نے مقدمہ درج کر لیا لیکن ہماری دادرسی نہ کی گئی۔ پولیس نے دوران تفتیش نامزد ملزمان کو ہتھکڑیاں لگانے کی بجائے تھانے میں مکمل پروٹوکول دیا۔پولیس نے پیسے لے کر پورے وقوعے کو بدل ڈالا اور سارا ملبہ اپنی نابالغ بھتیجی مریم بی بی پر ڈالنے کی کوشش کی۔کیونکہ مریم نابالغ ہونے کی وجہ سے یا تو سزا سے بچ جائے گی یا اُسے بہت کم سزا ہو گی۔ہم نے وہاڑی پولیس کو تفتیش کی تبدیلی کے لیے درخواست دی لیکن اس پر بھی کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔

اللہ رکھا نے بتایا ملزمان نے دھمکی دی ہے کہ وہ پولیس کو پیسے دے کر بے گناہ ہو جائیں گے اور بعد میں ماں کے ساتھ ساتھ اُسے بھی قتل کریں گے۔

اللہ رکھا نے حال ہی میں قائم ہونے والے وزیراعظم کے سٹیزن پورٹل پر بھی درخواست دے چکے ہیں مگر ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ڈی پی او، وہاڑی کو کئی درخواستیں دیں لیکن تا حال شنوائی نہیں ہوئی۔آر پی او، ملتان وسیم خان کے پاس والدہ کو لے کر گیا لیکن ریڈر نے یہ کہ کر ملاقات نہ کرنے دی کہ تمہارا مسئلہ وہاڑی میں ہی حل ہو گا۔

پھر چیف جسٹس آف پاکستان کے پاس درخواست لے کر حاضر ہوا لیکن سفارش نہ ہونے کی وجہ سے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔کمیشن برائے انسانی حقوق اسلام آباد سے رابطہ کیا تو انہوں تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں کیا۔

ظلم تو یہ ہے کہ پولیس نے ملزمان کے چالان کے بعد بے گناہ قرار دے دیا ہے حالانکہ گاؤں میں بھری پنچائیت میں میرے سگے ماموں نے کھلے عام جرم کا اقرار کیا تھا اور معافیاں بھی مانگی تھیں۔

اللہ رکھا نے کہا کہ یہاں صرف پیسے والے یا بااثر افراد کی سنی جاتی ہے۔کہتے تو ہیں نیا پاکستان لیکن کچھ نہیں بدل۔ وہی تھانہ، پیسہ اور اقربا پروری کا کلچر، مظلوم کی آواز سننے والا آج بھی کوئی نہیں۔

(بشکریہ سجاگ)

افسانہ: بندوق موجد کی کہانی

محمد جمیل اختر

یہ اس شخص کی کہانی ہے جس نے بندوق دوسری دفعہ ایجاد کی تھی۔

یہاں لفظ 'دوسری دفعہ' وضاحت طلب ہے۔ دراصل جب سیکڑوں برس پہلے بارود ایجاد ہوا تو کچھ عرصے بعد بندوق بھی ایجاد ہوگئی لیکن جس شخص کی کہانی یہاں بیان کی جارہی ہے وہ ایک ایسے دُور دراز علاقے کا مکین تھا جہاں بندوق کے بارے صرف یہ اطلاع پہنچی تھی کہ اب کوئی ایسی شے ایجاد ہوگئی ہے جس سے انسان بہت دُور کھڑا ہوکر بھی اپنے مخالف پر حملہ کرسکتا ہے۔

اس علاقے کے لوگ اس بارے میں سوچتے کہ ایسا بھلا کیسے ممکن ہے؟ وہ قہوہ خانوں میں گھنٹوں اس پر بحث کرتے لیکن انہیں اس بارے میں کچھ سمجھ نہ آتی۔

بندوق سے متعلق ساری باتیں ان سوداگروں نے پہنچائی تھیں جو قریہ قریہ سامان بیچتے جاتے تو شہر شہر کی خبریں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے جاتے۔ انہی کے ذریعے بندوق کے بارے بھی ایسی ٹوٹی پھوٹی باتیں اس علاقے تک بھی پہنچ گئیں تھیں جہاں وہ شخص رہتا تھا جس نے بندوق دوسری دفعہ ایجاد کی۔

وہ شخص جو کسان تھا اور اس کا ایک پاؤں پیدائشی ٹیڑھا اور قد چھوٹا تھا۔ ایک شام قہوہ خانے میں بیٹھا تھا کہ وہاں اس کی اپنے پڑوسی سے لڑائی ہوجاتی ہے۔ اس کا پڑوسی اس سے زیادہ طاقتور اور جوشیلا تھا، لہٰذا وہ اٹھا اور اس کے بازوؤں کو اس کی پیٹھ پر باندھ کر قہوہ خانے کے فرش پر پٹخ دیا۔

اس نے اٹھنا چاہا لیکن پاؤں ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے پھر پھسل گیا اور فرش پر دھڑام سے گر گیا۔ اسی موقعے پر اس کے پڑوسی نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ وہاں موجود سب لوگ اس کی حالتِ زار پر ہنسنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک بونا ہے یا شاید اس سے بھی کہیں چھوٹا اور ان سب لوگوں کو زمین کی پرتوں سے دیکھ رہا ہے۔

اس نے سوچا کہ کاش اس کے بازوؤں میں یکدم ایسی طاقت بھر جائے کہ وہ اپنے پڑوسی کو اٹھا کر قہوہ خانے سے باہر پھینک دے لیکن اسے اپنے کمزور جسم کے بارے خوب معلوم تھا۔ وہ آہستگی سے بنچوں کے بَل اٹھا اور اپنے پڑوسی کو گھورتے ہوئے بغیر کچھ کہے قہوہ خانے سے باہر چلا گیا۔

اس کی بیوی جو اس سے بے حد محبت کرتی تھی، اس کے رات جلد گھر آجانے کی وجہ سے کچھ حیران ہوئی کیونکہ کافی عرصہ ہوا وہ آدھی رات سے پہلے گھر نہیں لوٹتا تھا۔

'سب خیریت تو ہے؟'، اس کی بیوی نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا چارپائی پر لیٹ کر آسمان کو گھورنے لگا۔ پھر اگلے کئی روز تک وہ گھر سے نہ نکلا اور نہ بیوی سے کوئی بات کی۔ بس جب بھوک لگتی تو کھانا کھا لیتا اور پھر سیدھا لیٹ کر آسمان کی جانب دیکھنے لگ جاتا۔

دوسری دفعہ بندوق کا موجد ان دنوں سوچتا تھا کہ کیسے وہ اپنے پڑوسی سے بدلہ لے سکتا ہے جب کہ اس کا جسم کمزور ہے۔ کئی بار اُسے خیال آیا کہ وہ اسے دُور کھڑا ہوکر پتھر دے مارے اور وہاں سے بھاگ جائے، لیکن وہ ٹیڑھے پاؤں کی وجہ سے بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ تلوار سے حملہ کرنے کی اس میں قابلیت نہیں تھی لیکن وہ چاہتا تھا کہ بدلہ لے۔

آخر ایک روز یونہی سوچتے ہوئے اس کے ذہن میں سوداگر کی سنائی بات آئی کہ دنیا کے کسی کونے میں ایک ایسا ہتھیار ایجاد ہوگیا ہے جس سے آدمی بہت فاصلے سے اپنے مخالف پر حملہ کرسکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کے دل و دماغ سے بھاری بوجھ کم ہوگیا اور اس نے سوچا کہ یہی وہ شے ہے جس کی اسے تلاش ہے، اور اسی کی مدد سے وہ اپنی بے عزتی کا بدلہ چُکا سکتا ہے۔

> اس کی بیوی جو اس سے بے حد محبت کرتی تھی، اس کے رات جلد گھر آجانے کی وجہ سے کچھ حیران ہوئی کیونکہ کافی عرصہ ہوا وہ آدھی رات سے پہلے گھر نہیں لوٹتا تھا۔

لیکن اسے سمجھ نہ آتی کہ آخر وہ ہتھیار ہوتا کیسا ہے اور کیسے مخالف پر دُور ہی سے حملہ کیا جاسکتا ہے؟ وہ دن رات یہی سوچتا رہتا۔ پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ کسی دُور دراز علاقے سے ایک سوداگر اس کے شہر میں آیا ہے، وہ فوراً اس کے پاس پہنچا اور پوچھا

'جناب! آپ دنیا کے کس کس شہر میں اب تک گھوم چکے ہیں؟'

'میں تقریباً ساری دنیا دیکھ چکا ہوں۔ اِس سفر میں، مَیں نے ایسے علاقے بھی دیکھے ہیں جن میں 6 ماہ دن اور 6 ماہ رات رہتی تھی۔ دنیا میں ایسے علاقے بھی موجود ہیں جہاں ہر روز برف گرتی ہے اور کچھ ایسے صحرا ہیں جو اس قدر گرم ہیں کہ ننگے پاؤں چلنے والوں کے پیر کباب ہوجاتے ہیں'۔

'مجھے ان علاقوں کے بارے کچھ مزید جاننا ہے'، اس نے سوداگر سے کہا۔

'ہاں ہاں ضرور پوچھو کیا پوچھنا ہے'؟

'دراصل میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں لڑائی کے کون کون سے طریقے رائج ہیں؟ کیا وہ تلواروں سے لڑتے ہیں یا کوئی اور چیز بھی ایجاد ہوچکی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے علاقے میں ایک سوداگر آیا تھا جس نے ہمیں بتایا کہ دنیا میں ایک ایسا ہتھیار ایجاد ہوچکا ہے جس سے آدمی دُور کھڑے ہوکر بھی مخالف پر حملہ کیا جاسکتا ہے، کیا یہ سچ ہے'؟

'ہاں، ہاں بالکل ایسا ہے۔ تم بندوق کی بات کررہے ہو۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے مخالف پر بہت دُور سے حملہ کیا جاسکتا ہے، مگر اس کے چلنے کا شور اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ آدمی کے کان بند ہوجاتے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ بندوقوں سے کس قدر شور نکلتا ہے اور وہ کتنی خطرناک ہیں کہ اِدھر گولی چلی اور اُدھر دشمن ختم'۔

فاصلے سے حملہ کرنے والی بات اُس کے ذہن میں اٹک گئی۔

'اوہ اچھا! کیا آپ مجھے یہ بتاسکتے ہیں کہ وہ بندوق ہوتی کیسی ہے یعنی اس کی شکل کیسی ہوتی ہے'؟

'بالکل سیدھی ایسے'، سوداگر نے ہاتھ اور بازو سے اشارہ کیا۔

'اگر آپ زمین پر بندوق کی شکل بنا کر دِکھا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی'، اس نے سوداگر کی منت کی۔

ہاں ہاں کیوں نہیں، یہ کہہ کر سوداگر نے پاس پڑا لکڑی کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اور زمین پر چند لائنیں کھینچ کر ایک شکل بنائی۔

'یہ دیکھو ایسی ہوتی ہے بندوق، یہ لمبی لائن اس کی نالی ہوتی ہے جس سے گولی باہر نکلتی ہے اور یہ جو بٹن ہے جیسے ہی دباتے ہیں گولی سیدھی اسی لمبی لکیر سے باہر نکل کر مخالف کو جا لگتی ہے اور یہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں تمہیں نظر آرہی ہیں یہ ہیں وہ گولیاں جو اس بندوق میں ڈالی جاتی ہیں'۔

دوسری دفعہ بندوق کا موجد آنکھیں پھاڑے اس تصویر کو غور سے دیکھ کر یاد کرنے لگا۔ وہ کافی دیر وہیں زمین پر بیٹھا رہا حتٰی کہ سوداگر وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ لیکن وہ اس وقت تک وہیں بیٹھا رہا جب تک اس کے ذہن میں بندوق کی شکل نقش نہیں ہوگئی۔

اس کے بعد کی کہانی کچھ عجیب سی ہے۔ وہ آدمی گھر آکر خود کو ایک کمرے میں بند کرلیتا ہے۔ اس کی بیوی اس سے بات کرنے کو ترستی رہتی لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور کمرے میں بند رہتا۔ کبھی بھی اپنے کھیتوں کی جانب رُخ نہ کرتا، گھر میں فاقوں کی نوبت آگئی تو اس کی بیوی نے علاقے میں بھیک مانگنی شروع کردی۔ وہ گھر گھر جا کر روٹی اکھٹی کرتی، خود بھی کھاتی اور اس شخص کو بھی کھلاتی کہ جس سے وہ بے حد محبت کرتی تھی اور یہ محبت ہی تھی جس کی وجہ سے وہ اب تک اس کے ساتھ رہتی آئی تھی حالانکہ اس کے شوہر نے اس سے بولنا کئی مہینوں سے ترک کر رکھا تھا، بلکہ وہ تو اب دنیا میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

اس کمرے میں اس کے پاس چند اوزار، پتھر، لوہے اور لکڑی کے ٹکڑے تھے اور وہ دن رات ان کی مدد سے بندوق بنانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ جب اسے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ گھر سے باہر مزید ایسی چیزیں ڈھونڈنے نکلتا جن سے بندوق بنائی جاسکتی تھی، لیکن تب بھی وہ کسی سے کچھ گفتگو نہ کرتا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے۔ بہت سال جب وہ اپنے تاریک کمرے میں تجربے کرتا رہا تو ایک روز وہ ایسی بندوق بنانے میں کامیاب ہوگیا جس سے ایک پتھر کوئی فٹ دُور پھینکا جاسکتا تھا کہ اُس کے پاس بارود کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی۔

جب اس نے بندوق دوسری دفعہ ایجاد کرلی تو بہت خوش ہوا لیکن اب وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے اور اس بندوق کو بنانے کا مقصد کیا تھا؟

پاکستان اور انڈیا کے بیشتر اردو اخبارات اور جرائد میں محمد جمیل اختر کے افسانے شائع ہوچکے ہیں، جس میں فنون، ادبیات، ایوان اردو دہلی، ادب لطیف، اردو ڈائجسٹ اور سہ ماہی تسطیر قابل ذکر ہیں۔ افسانوں کی پہلی کتاب 'ٹوٹی ہوئی سڑک' 2017 میں شائع ہوئی۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جاسکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازدواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے، جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

Human Rights Commission of Pakistan
جہد حق
Monthly JEHD-E-HAQ

اسلام آباد، 19 ستمبر 2019 : ایچ آر سی پی نے ''پاکستان کی عالمی قانونی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر مشاورتی اجلاس منعقد کیا

انسانی حقوق کے عالمی دن۔ اکتوبر

یکم اکتوبر	معمر افراد کا عالمی دن	15 اکتوبر	دیہی خواتین کا عالمی دن
2 اکتوبر	عدم تشدد کا عالمی دن	16 اکتوبر	خوراک کا عالمی دن (ایف اے او)
5 اکتوبر	اساتذہ کا عالمی دن (یونیسکو)	17 اکتوبر	غربت کے خاتمے کا عالمی دن
6 اکتوبر (اکتوبر کا پہلا سوموار)	جائے پیدائش کا عالمی دن	24 اکتوبر	اقوام متحدہ کا دن
9 اکتوبر	ڈاک کا عالمی دن	24 اکتوبر	ترقی سے متعلق معلومات کا عالمی دن
11 اکتوبر	بچیوں کا عالمی دن	27 اکتوبر	سماعتی و بصری ورثے کا عالمی دن (یونیسکو)
13 اکتوبر	آفات میں کمی کا عالمی دن		

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15